حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

حیات اور تعلیمات

پروفیسر محمد حبیب مرحوم

پروگریسو بکس
۴۰۔ بی اردو بازار ○ لاہور

ناشر : پروگریسو بکس لاہور

مطبع : حامد اینڈ کمپنی پرنٹرز پبلشرز لاہور

قیمت : ۲۴۔ چوبیس روپے صرف

تاریخ اشاعت : ۱۹۶۴ء

پروفیسر محمد حبیب : ولادت : ۶ر جون ۱۸۹۶ء

خلف : جناب محمد نسیم

۱۹۰۷ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالجیٹ اسکول میں داخلہ لیا۔

۱۹۱۰ء میں ہائی اسکول (الہ آباد) فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

۱۹۱۴ء میں انٹرمیڈیٹ سائنس (الہ آباد) سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

۱۹۱۶ء میں بی. اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

ن پاک کی تلاوت و تفہیم کا پہلا انعام مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی نے
ت فرمایا۔

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک انگلستان میں رہے اور نیو کالج آکسفرڈ سے تاریخ میں آنرز کیا۔

ارنسٹ بارکر ان کے استاد تھے۔

ڈاکٹر مارگولیتھ کے ساتھ علمی اور تحقیقی کاموں میں شریک رہے۔

پنڈت موتی لال نہرو کے ارشاد کے مطابق ہندوستان آئے اور ان کے اخبار
ڈی پنڈنٹ کی ادارت میں شریک رہے۔

۱۹۲۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تاریخ کے ریڈر مقرر ہوئے۔

۱۹۲۳ء میں پروفیسر و صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ منتخب کیے گئے۔

۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۱ء تک یوپی لیجسلیٹو اسمبلی کے انتخابی ممبر رہے۔

۱۹۳۲ء میں ایران تشریف لے گئے۔

۱۹۳۳ء میں ہندوستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے افغانستان کا سفر کیا۔

۱۹۴۶-۴۷ء تک انڈین ہسٹری کانگریس کے صدر رہے۔

۱۹۴۸ء میں انجمن اقوام متحدہ کے ہندوستانی نمائندے کی حیثیت سے پیرس گئے۔

۱۹۵۱ء میں اسی حیثیت سے یونسکو کے اجلاس میں شرکت کی۔

۱۹۵۱ء میں ہندوستانی وفد کے ساتھ چین کا دورہ کیا۔

۱۹۵۵ء میں رومانیہ کی حکومت کی دعوت پر بخارسٹ گئے۔

علی گڑھ سے رٹائر ہونے کے بعد امیریٹس پروفیسر مقرر کیے گیے۔
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری مرحمت فرمائی۔
۱۹۷۱ء میں وفات علی گڑھ بعمر ۷۵ سال۔

تصانیف :

(۱) سلطان محمود غزنوی (انگریزی)
(۲) حضرت امیر خسرو (انگریزی)
(۳) سلاطینِ دہلی کا سیاسی نظریہ (انگریزی)
(۴) دورِ اوّل کے صوفیاء کرام (انگریزی) : شانتی نکیتن کے توسیعی خطبات ۱۹۳۶ء
(۵) تاریخ کبیر ہند، جلد پنجم (انگریزی) : جو پروفیسر خلیق احمد نظامی کے ساتھ مل کر تیار کی۔
(۶) حضرت نظام الدین اولیاؒ : حیات اور تعلیمات (اُردو) : نظام اُردو خطبات دہلی یونی ورسٹی ۱۹۷۰ء۔ جو آن کی سب سے آخری اور اُردو میں سب سے پہلی تصنیف ہے۔

تاریخِ وفات

عالی جناب پروفیسر محمد حبیب بی اے آنرز آکسن

سابق صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات
مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

وہ حبیبِ اہلِ علم و اہلِ فن
زندگی جس کی تھی حکمت کا سبق
منکشف جس کی فراست پر ہوا
کائناتِ علم کا اک اک طبق
جس کی فکرِ نکتہ رس نے حل کیا
مسئلہ تاریخ کا نازک، ادق
لفظ کو دانش کے بے سر کر گیا
علم کی تاریخ کا زرّیں ورق

۱۹۷۵
۴ −
۱۹۷۱ء

نتیجۂ فکر حضرت مغیث الدین فریدی

تمہید

فصلِ اوّل۔ مستند کتابیں

میں ایک گناہ گار آدمی ہوں جس کی تمام زندگی تلاش معاش میں گذری ہے۔ میرے لیے ناجائز ہوگا اگر روحانی معاملات میں ترجمانی سے آگے قدم بڑھاؤں۔

۔ لیکن ترجمانی صرف مستند کتابوں کی ہوسکتی ہے۔

میری زندگی کا ایک بڑا حصہ ہندوستان کی ازمنہ وسطیٰ کی کتابوں کے مطالعے میں گذرا ہے۔ خواجہ ضیاء الدین برنی کے فتاوی جہانداری کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران قدیم اور اسلامی دور عجم کے بارے میں اس مشہور مورخ نے بہت سی غیر مستند تاریخوں پر بھروسا کیا ہے جو اب بالکل غائب ہوگئی ہیں اور صرف فتادی جہانداری میں جو اقتباسات دیئے ہوئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کتابوں کے لکھنے والے کس قدر لاعلم اور قصہ گو تھے۔ بہرحال تاریخ میں کوئی نہیں چاہتا تھا کہ مستند کتابوں کو چھوڑ کر غیر مستند کتابوں کی کتابت پر اپنی رقم ضائع کرے۔ اسی طرح تصوف (یعنی اصولِ تصوف اور

حالات مشائخ) پر بہت سی غیر مستند کتابیں لکھی گئی تھیں لیکن چونکہ ان کو صوفی بزرگوں سے منسوب کر دیا گیا تھا، اس لیے تبرک کے خیال سے ان غیر مستند کتابوں کے نسخوں کو احتیاط سے رکھا گیا، ان کی نقلیں کرائی گئیں اور ان میں سے کچھ چھپ بھی گئی ہیں۔ پڑھی بھی جاتی ہیں۔ لیکن پہلے مستند کتابوں کا ذکر ضروری ہے۔

فوائد الفواد، مصنفہ امیر حسن علا سجزی

۳ رمضان ۷۰۷ھ کو مشہور شاعر امیر حسن علا سجزی شیخ نظام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جو کچھ انھوں نے آپ کی زبان مبارک سے سنا تھا اس کو غور سے یاد رکھا اور مکان پر جا کر قلم بند کیا۔ اسی طرح سے وہ آپ کے الفاظ ایک سال سے زیادہ تک قلم بند کرتے رہے۔ ہر مجلس کا دن، تاریخ اور مہینہ احتیاط سے دیتے رہے تاکہ سند رہے۔ ۸ رشوال ۷۰۸ھ کی مجلس کے بارے میں امیر حسن سجزی لکھتے ہیں: "نیک وقت تھا اور خلوت با راحت تھی۔ میں نے اپنا ماتھا زمین پر رکھ دیا اور کہا کہ ایک عرضداشت ہے اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔ آپ نے فرمایا، کہو۔ میں نے عرض کیا کہ ایک سال سے زیادہ ہوا ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں۔ اور جب بھی مجھے سعادت قدمبوسی حاصل ہوتی ہے آپ کے قیمتی الفاظ سے فائدہ حاصل کرتا ہوں (مختلف باتوں پر جیسے) وعظ و نصیحت، طاعت کی ترغیب اور حکایات شیخ اور ان کے احوال۔ جو کلمات روح افزا آپ کے میں نے سنے ہیں ان کو اپنی فہم کے مطابق قلم بند کر لیا ہے، تاکہ ان سے اپنی بیچارگی کی راہ میں اور اپنی شکستہ زندگی کی ہدایت میں (کام لوں)۔ آپ نے اکثر فرمایا ہے کہ مشائخ کی کتابوں اور ان اشارات کو جو انھوں نے سلوک کے بارے میں بیان کیے ہیں،

نظر میں رکھنا چاہیے۔ میرے لیے کوئی مجموعہ آپ کے الفاظ جاں بخش سے اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے جو کچھ بندے نے آپ کے ملفوظاتِ مبارک اب تک سُنے ہیں، جمع کر لیے ہیں۔ اس وقت تک میں نے اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اب آپ کا کیا فرمان ہے؟"

شیخ نظام الدینؒ نے بیان کیا جب وہ شیخ فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو انھوں نے بھی شیخ فریدؒ کے الفاظ لکھ لیے تھے۔" پھر حضور نے فرمایا کہ کیا ان کاغذوں کو جو تم نے لکھے ہیں، لائے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ لایا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ دکھاؤ۔ میں نے چھ جزو کاغذ کے جو لکھے تھے، آپ کے دست مبارک میں دے دیئے۔ آپ نے ان کا مطالعہ کیا اور تعریف کی۔ آپ پڑھتے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ خوب لکھا ہے! خوب لکھا ہے۔ ایک دو جگہ میں نے بیاض چھوڑ دی تھی۔ آپ نے دریافت کیا۔ کہ بیاض کیوں چھوڑ دی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ باقی الفاظ مجھے ٹھیک یاد نہیں رہے۔ آپ نے شفقت فرمائی اور ہر بیان کے باقی الفاظ بتا دیئے تاکہ وہ بیان پورا ہو جائے۔ یہ آپ کی شفقت، محبت اور پرورش تھی۔"

۴ محرم ۷۱۴ھ کو امیر حسن سجزی فوائد الفواد کی جلد اول فرمان کے مطابق حضور کی خدمت میں لے گئے۔ حضور نے اس کا مطالعہ کر کے تعریف کی اور فرمایا: "تم نے صحیح طریقے سے لکھا ہے، درویشانہ طور سے لکھا ہے اور نام نیک حاصل کیا ہے۔"

۹ شوال ۷۱۶ھ: "حضور نے پوچھا کہ کیا جو باتیں تم مجھ سے سنتے ہو، بجنسہٖ ویسی ہی لکھتے ہو۔ بندے نے عرض کیا کہ ہاں میں لکھتا ہوں۔ حضور نے فرمایا کہ تعجب ہے کہ تم کو یاد رہتا ہے۔ بندے نے عرض کیا کہ یاد رہتا ہے،

لیکن اگر کسی جگہ یاد نہیں رہتا یا معنی ٹھیک سمجھ میں نہیں آتے تو میں بیاض (یعنی سادی جگہ) چھوڑ دیتا ہوں اور جب آپ دوسری دفعہ اس معاملے کو بیان کرتے ہیں تو بیاض میں لکھ لیتا ہوں۔

اسی طرح پچیس سال کی محنت کے بعد ۲۰ شعبان ۷۲۲ھ کو فوائد الفواد کی پانچ جلدیں ختم ہوئیں۔ اصل میں یہ ایک ہی کتاب ہے۔ حضور کی زندگی پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں فوائد الفواد سب سے زیادہ مستند ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ حضور کی نظر ثانی سے یہ کتاب کہاں تک مستفید ہوئی، لیکن امیر حسن سجزی کے ایسے اہل قلم کی کتاب کو نظر ثانی کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ حضور کے سب مریدوں اور خلفاء نے اس کو مستند مانا ہے۔ فوائد الفواد کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ اس نے تصوف کی کتابوں میں ایک نئی صنف پیدا کی جس کو "ملفوظات" کہتے ہیں۔ امیر خورد نے سیر الاولیا میں لکھا ہے کہ حضرت امیر خسرو اس کے لیے تیار تھے کہ میں اپنا کل کلام دے دوں اور فوائد الفواد لے لوں۔ امیر خورد یہ بھی کہتے ہیں کہ حضور کے کئی مریدوں نے امیر حسن سجزی کی طرح حضور کے ملفوظات جمع کیے۔ مگر فوائد الفواد کے مقابلے میں وہ مقبول نہ ہوئے اور ہم تک نہیں پہنچے[1]

---

[1] سیر الاولیاء نے ان ملفوظات کے نام حسب ذیل دیے ہیں:

(ا) "انوار المجالس" مصنفہ خواجہ محمد ابن شیخ بدر الدین اسحاق (ص ۲۰۰)

(ب) "تحفۃ الابرار و کرامۃ الاخیار" مصنفہ خواجہ عزیز الدین صوفی (ص ۲۰۲)

(ج) "درر نظامیہ" مصنفہ مولانا علی جاندار۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب کے مطابق اس کتاب کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔

فوائد الفواد کو مطبع نولکشور، لکھنؤ نے چوتھی بار ۱۹۰۸ء میں شائع کیا تھا اور مطبعوں نے بھی اس کو شائع کیا ہے۔ لیکن اب پاکستان میں اس کو بہت محنت سے محمد لطیف صاحب ملک نے صحت کے ساتھ چھاپا ہے۔

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام صاحب کو، جنھوں نے اسلامی تاریخ اور تہذیب کے بغور مطالعے میں اپنی زندگی صرف کی ہے اور جن کی کتابیں (آبِ کوثر، موجِ کوثر، رودِ کوثر) ہندوستان میں بھی مقبول ہوئی ہیں، فوائد الفواد کے چھاپنے کے لیے محکمۂ اوقاف پاکستان نے مالی مدد دی ہے۔[1]

دیوانِ امیر حسن سجزی کو مولانا مسعود علی صاحب محوی بی، اے (علیگ) سابق سشن جج سرکارِ آصفیہ نے مکتبۂ ابراہیمیہ پریس، حیدرآباد دکن سے ۱۳۵۲ھ (مطابق ۱۹۳۳ء) میں شائع کیا ہے۔ آپ نے امیر حسن سجزی کے بارے میں جو کچھ ضیاء الدین برنی اور امیر خورد سے لے کر (جو امیر حسن سے ذاتی طور پر واقف تھے) دورِ مغلیہ تک لکھا گیا ہے، اس کو جمع کر کے بحیثیت ایک نقاد کے صحیح رائے قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ محوی صاحب جن نتائج پر پہنچے ہیں، میں ان سے بالکل متفق ہوں البتہ جو کچھ امیر حسن کے بارے میں سیر العارفین اور تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے وہ غیر مستند اور لغو ہے اور اس پر کچھ دھیان نہ دینا چاہیے۔ ایک شخص جس کی برنی اور امیر خورد جو اس کے ہمعصر اور دوست تھے، تعریف کرتے ہیں اور جس کا مولانا جامی نے اپنی بہارستان میں احترام کے ساتھ ذکر کیا ہے" اس پر بغیر کسی سند کے مصنف سیر العارفین نے پچھتر برس کی عمر میں شرابی ہونے

---

[1] از سر... بازار کشمیری، لاہور، پاکستان

کا الزام لگایا ہے۔ فرشتہ کا بیان تو اس سلسلے میں بالکل قابل توجہ نہیں ہے۔

امیر حسن علا سجزی کے حالات زندگی کا خلاصہ محوی صاحب کے دیباچے کی بنیاد پر یہاں اختصار سے بیان کیا جاتا ہے۔ آپ کے والد کا نام نجم الدین تھا۔ آپ سنہ ۶۵۲ھ (مطابق سنہ ۱۲۵۵ء) میں بدایوں میں پیدا ہوئے[1]۔ آپ کا زمانۂ تعلیم دہلی میں گذرا۔ لیکن آپ کے اساتذہ وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں مل سکا ہے۔ آپ امیر خسرو سے ایک سال چھوٹے تھے۔ جب آپ کی عمر ۲۷ سال کی تھی، سلطان بلبن کے بڑے بیٹے، سلطان محمد نے امیر خسرو کو مصحف دار اور امیر حسن کو دوات دار مقرر کیا۔ بہر حال دونوں دوست امراء کے طبقے میں داخل ہو گئے حالانکہ صرف نیچے طبقے کے امراء تھے۔ پانچ سال آپ سلطان محمد (جن کو فارسی مؤرخ خان شہید کے نام سے یاد کرتے ہیں) کی خدمت میں رہے۔ سلطان محمد کی شہادت پر امیر خسرو نے ایک عام فہم لیکن پُر درد اور پُر اثر مرثیہ نظم میں اور حسن سجزی نے ایک مرثیہ بہت ادق اور مشکل نثر میں لکھا۔ عبد القادر بدایونی نے دونوں مرثیوں کا بڑا حصہ اپنی منتخب التواریخ کی پہلی جلد میں شامل کر دیا ہے۔ غالباً امیر حسن سلطان کیقباد اور سلطان جلال الدین خلجی کے زمانے میں فوج کے شعبۂ اہلِ قلم میں ملازم رہے۔ اُن کے بہت سے قصیدے

---

[1] بدایوں کی پیدائش کے قبول کرنے میں مجھے کچھ جھجک ہوتی ہے۔ آپ نے بدایوں کا اکثر ذکر کیا ہے لیکن کوئی خاص محبت کا اظہار نہیں کیا۔ ایک دفعہ آپ نے بدایوں سے واپس آکر حضور شیخ نظام الدین سے کہا کہ مجھے اس سفر سے صرف یہ فائدہ ہوا کہ چند مزاروں پر فاتحہ پڑھ سکا۔ مزاروں کو آپ نے گنایا ہے لیکن ان میں اپنے خاندان کے کسی بزرگ کی قبر کا نام نہیں لیا ہے۔

الغ خان کی تعریف میں ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا خیال تھا کہ الغ خان سے سلطان بلبن مراد ہے لیکن محوی صاحب نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ قصیدے علاء الدین خلجی کے چھوٹے بھائی الغ خان کی تعریف میں ہیں۔ محوی صاحب کا خیال ہے کہ امیر حسن سجزی کی وہی تنخواہ تھی جو حضرت امیر خسرو کی تھی، یعنی ایک ہزار روپیہ سالانہ یا ۸۴ تنکہ ماہانہ۔ پھر محوی صاحب لکھتے ہیں: "فوائد الفواد کے بعض مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر حسن ایک متوسط حال شخص کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔" آپ نے مجردانہ زندگی بسر کی، لیکن آپ کے خاندان کا بوجھ آپ کے اوپر کافی تھا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ نے افلاس اور تنگی پر کچھ شعر کہے ہیں۔ جب آپ نے حضور سے بیعت کی تو آپ کی عمر غالباً ۵۴ سال کی تھی۔ جب سلطان محمد بن تغلق نے دیوگیر میں اپنا دوسرا پایہ تخت بنایا تو آپ کو وہاں جانا پڑا، اور وہیں آپ کا ۷۳۷ھ یا ۷۳۸ھ میں انتقال ہوا۔ آپ کا مزار خلد آباد ضلع اورنگ آباد میں ہے۔

خیر المجالس، مصنفہ حمید قلندر

شیخ نظام الدین اولیاء کے ایک مرید مولانا تاج الدین تھے۔ ایک شام کو حضور نے اپنے اس چھوٹے مکان میں جو مسجد کیلوکھڑی کے سامنے تھا، افطار کیا۔ آپ کے پاس ایک قرص یا موٹی روٹی تھی جس کے آپ نے دو حصے کیے۔ ایک حصہ خود کھایا اور دوسرا حصہ مولانا تاج الدین کے بیٹے حمید الدین کو دیا۔ حمید نے روٹی کے حصے کو اپنی آستین میں چھپا لیا، لیکن جب وہ دہلیز خانہ تک پہنچا تو اس کو قلندروں نے گھیر لیا اور مطالبہ کیا کہ آدھی روٹی جو شیخ نے اسے عنایت فرمائی ہے انہیں دے دے۔ حمید نے

اپنی بے بسی میں وہ آدھی روٹی قلندروں کو دے دی۔ وہ اُس کو فوراً کھا گئے۔ جب مولانا تاج الدین باہر آئے تو اُن کو یہ بہت بُرا لگا۔ کچھ رنجیدہ اور کچھ خفا، وہ حمید کو حضور کے پاس لائے۔ حضور نے فرمایا: "مولانا تاج الدین خاطر جمع رکھو، یہ بیٹا تمھارا قلندر ہوگا"۔ اس پیشین گوئی سے مولانا تاج الدین کو کچھ اطمینان ہوگیا۔

اپنے باپ کی طرح حمید (یا حمید الدین) بھی حضور کے مرید تھے۔ انھوں نے حصولِ تعلیم کے بعد قلندری وضع اختیار کرلی، داڑھی مونچھیں صاف کرادیں، اور گیروا لباس پہن کر مجرّدانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ آپ کے ابتدائی حالات ہم کو بہت کم معلوم ہیں۔

وہ دہلی سے دکن گئے۔ وہاں حضور کے خلیفہ شیخ برہان الدین غریب کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہوگئے اور ان کے ملفوظات لکھنے شروع کردیئے۔ لیکن جب شیخ برہان الدین کا انتقال ہوگیا تو حمید قلندر دکن چھوڑ کر دہلی واپس آگئے۔

ان حالات کو سمجھنے کے لیے جو خیر المجالس کی ترتیب و تدوین کا باعث ہوئے، حضور کے خلیفۂ اعلیٰ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے حالات زندگی سے کچھ واقفیت ضروری ہے۔ میرے عزیز ساتھی پروفیسر خلیق احمد نظامی کی تحقیق کے مطابق آپ کی پیدائش اودھ میں ۶۷۵ھ (مطابق ۷۔۱۲۷۶ء) میں ہوئی[1]۔ آپ کے والد شیخ یحییٰ ایک خوش حال تاجر تھے۔ شیخ نصیر الدین کی

---

[1] خیر المجالس کی انگریزی تمہید۔ میں نے اس پیراگراف کی بنیاد پروفیسر نظامی کی تمہید اور سیر الاولیا کے باب چہارم پر رکھی ہے۔

عمر صرف نو برس کی تھی، جب ان کا انتقال ہوگیا۔ آپ کی والدہ نے تعلیم کا انتظام کیا۔ ممکن ہے کہ آپ تعلیم کے لیے دہلی آئے ہوں اور وہاں حضور کے مرید بھی ہوگئے ہوں۔ لیکن پروفیسر نظامی صاحب اس معاملہ میں خاموش ہیں۔ بہر حال آپ ۴۳ برس کی عمر میں دہلی آکر حضور کے اعلیٰ مریدوں میں شامل ہوگئے تھے۔ خیر المجالس میں فرماتے ہیں کہ آپ کا خاندان اپنے جیسے دس آدمیوں کی رہائش کے اسباب فراہم کر سکتا تھا لیکن آپ نے حضور کی تعلیم کے مطابق مجردانہ زندگی اختیار کی اور فتوح پر گذر کرنا شروع کیا۔ فتوح کے معنی آپ کے لیے فاقہ کشی تھے۔ آپ نے امیر خسرو کے ذریعے سے حضور شیخ نظام الدین اولیاؒ سے اجازت مانگی کہ کسی گوشے میں جاکر عبادت کرنے لگیں، لیکن حضور کا حکم بہت صاف تھا "امیر خسرو! نصیر الدین سے کہدو کہ تمھیں خلق میں رہنا اور لوگوں کے جور و ظلم سہنا چاہیے۔ اور ان کے عوض میں بذل اور ایثار، سخاوت اور بخشش کرنا چاہیے۔"

اس کے صاف معنی یہ تھے کہ حضور کی جگہ ایک دن ان کو کام کرنا ہوگا۔ چنانچہ حضور کے انتقال کے بعد ۳۲ سال تک دہلی میں چشتیہ سلسلے کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ سنہ ۱۳۵۱ء میں آپ کو خواہ مخواہ محمد بن تغلق نے سندھ بلا لیا اور آپ کے سفر اور آسائش کا کوئی سامان نہیں کیا۔

شیخ نصیر الدین چراغ اپنے مرحوم دوست شیخ برہان الدین غریب کے عرس کا اہتمام کر رہے تھے کہ حمید قلندر آپ کے پاس آئے۔ آپ کو جب یہ معلوم ہوا کہ حمید قلندر شیخ نظام الدین کے مرید ہیں، تو بہت تپاک سے اُن سے ملے۔ دوسری ملاقات میں حمید قلندر نے آپ کو وہ کاغذات

دکھائے جن میں انھوں نے شیخ برہان الدین کے ملفوظ درج کیے تھے۔ شیخ نصیر الدین نے ان کو اپنے ملفوظ جمع کرنے کی اجازت دے دی۔ حمید قلندر نے خیر المجالس ۷۵۵ھ میں مرتب کرنی شروع کی اور ۷۵۶ھ میں ختم کی۔ کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ لکھا ہے جس میں شیخ نصیر الدین کی باقی زندگی کے حالات مختصراً درج کیے ہیں۔

خیر المجالس کا ایک بہت صاف اور دل کش ایڈیشن پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے تیار کیا ہے۔ وہ ان چند بہت صحیح فارسی کتابوں میں ہے جو ہندوستان میں شائع ہوئی ہیں[1]۔ خیر المجالس کے بارے میں پروفیسر نظامی صاحب لکھتے ہیں۔ "خیر المجالس کا پڑھنے والا شیخ نصیر الدین سے مختلف اوقات اور مختلف جذباتی حالات میں ملتا ہے اور ان کی شخصیت اور مختلف مواقع پر ان کے طرز عمل سے واقف ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چودھویں صدی ہجری کے ملفوظات میں خیر المجالس اپنے خیالات کی خوبی اور اصطلاحات کی صفائی کی وجہ سے دوسرے ملفوظات سے بازی لے جاتی ہے۔ اس میں نہ کوئی بے معنی کرامتیں ہیں، نہ مبہم اور لایعنی گفتار۔ اس میں یہ خوبی شیخ نصیر الدین کی وجہ سے ہے، حمید قلندر ہمیشہ چاہتے تھے کہ آپ کی نسبت کرامتیں بیان کریں مگر ان کو ہمیشہ اس سے روکنا پڑتا تھا"[2]

---

[1] مطبوعات شعبہ تاریخ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔ بمبئی کے کیو پریس، محمد علی روڈ نے چھاپا ہے۔

[2] پروفیسر نظامی صاحب ایک فٹ نوٹ (صفحہ ۵) میں لکھتے ہیں۔ شیخ نصیر الدین اس معاملے میں بہت سخت تھے۔ وہ اس کے لیے نہیں تیار تھے کہ ان کے الفاظ کو لوگ غلط طرح سے لکھیں آپ نے ایک مرید کو اپنے ملفوظ لکھنے سے روکا (جوامع الکلم، ص ۱۳۴) سید محمد گیسو دراز نے

(باقی ص ۱۱ پر)

حضور شیخ نظام الدین کے خیالات اور حالات زندگی کے لیے خیر المجالس خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ شیخ نصیر الدین چراغ حضور کے سب سے عزیز اور معتبر خلیفہ تھے۔ ہم کو خیر المجالس میں بہت سی ایسی تفصیلات ملتی ہیں جن کا فوائد الفواد میں ذکر نہیں ہے۔ پیر کو سجدہ کرنے کی ایک بڑی رسم چشتیہ سلسلے میں قائم تھی، حضور شیخ نظام الدین کو یہ رسم پسند نہ تھی لیکن آپ نے سلسلے کی روایات کے خیال سے اس کو جاری رکھا۔ شیخ نصیر الدین نے اس رسم کو سختی سے بند کر دیا۔ اس اصول پر کہ خدا کے علاوہ کسی مخلوق کو سجدہ کرنا بالکل ناجائز ہے۔

سیر الاولیاء مصنفہ سید مبارک علوی کرمانی المدعو بہ امیر خورد

یہ ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کی تاریخ کی بنیادی کتاب ہے۔ اگر یہ کتاب زمانہ کی گردشوں سے نہ بچ گئی ہوتی تو ہماری واقفیت سلسلۂ چشتیہ کے متعلق اتنی ہی کم ہوتی جتنی کہ سلسلۂ سہروردیہ کے متعلق ہے۔ پہلے مصنف کے خاندان کا کچھ ذکر ضروری ہے کیونکہ حضور سے ان کا بہت گہرا تعلق رہا تھا۔ مصنف کے دادا سید محمد محمود کرمان کے رئیس اور خوش حال تاجر تھے، سید محمد محمود کے چچا

(صفحہ ۱۰ سے آگے) ایک دفعہ اپنی مجلس کو بتایا کہ شیخ نصیر الدین کے بھانجے مولانا کمال الدین ان کے پاس دو جزو اس ملفوظ کے لائے تھے جو حمید قلندر نے تیار کیا تھا۔ شیخ نصیر الدین نے ان کو پڑھ کر فرمایا کہ "میں نے کچھ کہا تھا اور حمید الدین نے کچھ اور ہی لکھا ہے۔" یہ کہہ کر آپ نے کاغذ پھینک دیا۔ مولانا کمال الدین نے عرض کیا کہ "شیخ نظام الدین کی یادگار میں ایک ملفوظ ہے، آپ کی یادگار میں بھی ایک ملفوظ ہونا چاہیے۔" اس پر پروفیسر نظامی صاحب اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں: "ایسا واقعہ خیر المجالس کی ترتیب کے بالکل ابتدائی زمانہ میں پیش آیا ہوگا۔ یہ ثابت ہے کہ شیخ نصیر الدین نے تمام کتاب پر نظر ثانی کی ہے اور جہاں تک ممکن تھا اس میں اپنی گفتگو کی صحیح تفصیلات [illegible] ہے۔"

سید احمد کرمانی ملتان کے دارالضرب کے افسر اعلیٰ تھے۔ سید محمد تجارت کے لیے اکثر ہندوستان آیا کرتے تھے۔ سید احمد کی خواہش تھی کہ سید محمد محمود ان کی بیٹی بی بی رانی سے شادی کرلیں اور ملتان میں رہنا شروع کریں۔ لیکن سید محمد محمود کرمانی شیخ فرید کی روحانی زندگی سے اتنے متاثر ہوئے کہ مع اپنی بی بی کے اجودھن میں رہنے لگے اور شیخ فرید کے حلقۂ مریدی میں شامل ہوگئے۔ وہ اٹھارہ سال شیخ فرید کے ساتھ رہے اور ان کے انتقال کے بعد اپنے پورے خاندان کو لے کر دہلی آگئے۔ جہاں بارہ سال تک حضور شیخ نظام الدین اولیاء کے دامنِ تربیت سے وابستہ رہے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب شیخ نظام الدین اولیاء بڑی تنگی اور عسرت سے گزر اوقات کرتے تھے۔ سید محمد محمود کرمانی کے چار بیٹے تھے۔ (۱) ابوالقاسم سید نورالدین مبارک کرمانی (۲) سید کمال الدین امیر احمد (۳) سید قطب الدین حسین (۴) اور سید خاموش۔

سید نورالدین مبارک کرمانی کے تین لڑکے تھے، محمد مبارک علوی کرمانی امیرِ خورد مصنف سیر الاولیاء، سید لقمان اور سید داؤد۔ سید کمال الدین امیر احمد کے دو بیٹے تھے، سید نورالدین اور عماد الدین امیر صالح۔ سیّد قطب الدین نے مجرّدانہ زندگی بسر کی اور حضور ان کو اپنا بیٹا کہتے تھے۔ جب تک حضور زندہ رہے، سادات کا یہ خاندان آپ کے پڑوس میں رہا۔ سیّد نورالدین مبارک کرمانی نے نوے برس کی عمر پائی اور ۱۵ صفر ۷۴۹ھ کو انتقال ہوا۔ آپ کو حضور کی خدمت کا بہت موقع ملا، ایک زمانہ میں اقبال کے علاوہ حضور کا کوئی اور خادم نہیں تھا۔ سید نورالدین مبارک ہی حضور کی تمام ذاتی خدمات انجام دیتے تھے۔

حضور کے انتقال کے بعد تمام مشایخ وصوفیہ کو محمد بن تغلق کی پالیسی کا

سامنا کرنا پڑا۔ نئے بادشاہ کے دو حکم تھے۔ اول سلطنت کی نوکری کرو، دوم دکھن جاؤ۔ چنانچہ سید کمال الدین امیر احمد کو تلنگانہ میں فوج کا افسر مقرر کیا گیا۔ کچھ دنوں بعد وہ قید کر دیے گئے۔ قید سے رہائی کے بعد پھر افسر مقرر ہو گئے، پہلی جمادی الآخر ۷۲۸ھ میں لاہور کی مہم کے دوران ان کا انتقال ہوا۔ سید خاموش جو قاضی محی الدین کاشانی کے شاگرد تھے ان کو خواجہ جہان نے دکھن جانے پر مجبور کیا اور ان کا وہیں ۷۳۲ھ میں انتقال ہوا۔ امیر خورد بھی اپنے چچا کے ساتھ دکھن گئے تھے، لیکن جب بہمنی سلطنت قائم ہو گئی تو آپ دہلی واپس آ گئے۔ امیر خورد نے اپنے ایک گناہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ گناہ سلطنت کی نوکری کرنا تھا، جو حضور کی تعلیمات کے سراسر خلاف تھا۔ دہلی واپس آنے کے بعد وہ شیخ نصیر الدین چراغ کی خدمت میں برابر حاضر ہوتے رہے اور کتاب سیر الاولیاء لکھی۔ چونکہ انھوں نے شیخ نصیر الدین کی وفات کی تاریخ (۱۸ ر رمضان ۷۵۷ھ مطابق ۱۲ ر ستمبر ۱۳۵۲ء) دی ہے اس لیے سیر الاولیاء اس کے ایک دو سال کے بعد ختم ہوئی ہوگی۔

سیر الاولیاء دس بابوں میں منقسم ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کے پہلے پانچ بابوں میں چشتی مشائخ کے حالات زندگی دیے گئے ہیں اور باقی پانچ بابوں میں مصنف نے کوشش کی ہے کہ چشتیہ سلسلے کے اصول اور تعلیمات بیان کریں۔ پہلے باب کے شروع کا حصہ چشتیہ روایات پر مبنی ہے لیکن شیخ قطب الدین بختیارؒ سے لے کر شیخ فرید اور ان کے خاندان اور حضور کے خلفاء اور مریدوں کا حال بہت تفصیل سے دیا ہے۔ امیر خورد لکھتے ہیں کہ بہت سی باتیں انھوں نے اپنے باپ سے دریافت کی تھیں لیکن اکثر دوسرے لوگوں کے حوالے بھی درج ہیں، جن کی سند پر واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

سیر الاولیاء میں صرف ایک نقص ہے۔ شروع سے آخیر تک کرامتوں کی ایک زنجیر چلی جاتی ہے۔ لیکن قطع نظر ان کرامتوں کے جو واقعات امیر خورد نے بیان کیے ہیں وہ صحیح ہیں اور ان کے جمع کرنے میں مصنف کو بہت کوشش کرنا پڑی ہوگی۔ امیر خورد نے حضور کے بہت سے اقوال دیئے ہیں جو اور کسی جگہ نہیں ملتے اور جن کی صحت پر کسی شبہ کی گنجایش نہیں۔ حضور کے ہاتھ کے لکھے ہوئے بہت سے مسودات امیر خورد کو دستیاب ہوئے جو انھوں نے سیر الاولیاء میں شامل کر لیے ہیں۔

سیر الاولیاء کے فارسی نسخے کو شعبان ۱۳۰۲ھ (مطابق مئی ۱۸۸۴ء) میں لالہ چرنجی لال مالک و مہتمم مطبع محب ہند، فیض بازار، دہلی نے شائع کیا تھا۔ اب یہ چھپی ہوئی کتاب کہیں نہیں ملتی ہے اور اس کا کاغذ بھی اس قدر خراب ہو گیا ہے کہ موڑنے سے پھٹ جاتا ہے۔ سیر الاولیاء فارسی کا صحیح نسخہ چھاپنا بہت ضروری ہے[1]

اخبار الاخیار مصنفہ مولانا شاہ عبد الحق محدث دہلوی۔

یہ ایک لاجواب کتاب ہے جو ۱۰۰۱ھ میں جہانگیر بادشاہ کے زمانے میں لکھی گئی۔ شیخ عبد الحق بغیر صحیح سند کے کوئی بات نہیں لکھتے۔ لیکن یہ تمام

---

[1] سیر الاولیاء (مطبوعہ چرنجی لال) کی ایک جلد مسلم یونی ورسٹی لائبریری میں تھی۔ میں نے اس کو تین چار دفعہ پڑھا لیکن ہر صفحہ اُلٹنے سے پھٹ جاتا تھا۔ اس لیے کتاب بیکار ہو گئی۔ پروفیسر نظامی صاحب کے پاس سیر الاولیاء کا نسخہ ہے اور انھوں نے یہ کتاب تیار کرنے کے لیے مجھے اپنی کتاب مستعار دی ہے۔ لیکن میں اس کو استعمال کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ کہیں کہیں میں نے مولانا غلام احمد بریاں کا ترجمہ بھی استعمال کیا ہے۔

صوفیاء ہند پر ایک جامع کتاب ہے۔ اس لیے حضور کی زندگی کے بارے میں ہم کو تفصیل سے واقعات نہیں ملتے۔

فصلِ دوم۔ غیر مستند کتابیں

سیر العارفین مصنفہ حامد بن فضل اللہ المخاطب بہ جمال خان والمعروف بہ شیخ جمالی۔

شیخ جمالی کو ہندوستان کے بزرگ صوفیوں میں سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے بہت سے اسلامی ملکوں کا سفر کیا تھا اور ہرات میں مولانا عبدالرحمٰن جامی کے مہمان رہے تھے۔ انھوں نے یہ کتاب ہمایوں کے زمانے میں لکھی تھی۔ انھوں نے سیر الاولیاء، فوائد الفواد اور خیر المجالس کو پڑھا تھا۔ اگر انھوں نے صرف ان ہی کتابوں پر اکتفا کیا ہوتا تو سیر العارفین ایک مستند کتاب ہوتی۔ لیکن حضور کے بعد دو سو سال سے زیادہ گذر گئے تھے اور اس زمانے میں دہلی میں بہت سے غیر مستند قصے مشہور ہو گئے تھے۔ شیخ جمالی نے ان قصوں کو بغیر جانچے ہوئے اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے۔ اس لیے مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ شیخ جمالی کے ایک بزرگ ہونے کے باوجود سیر العارفین ایک مستند کتاب نہیں سمجھی جا سکتی۔

دوسری غیر مستند کتابوں کے بارے میں جو گمنام شخصیتوں نے لکھی ہیں اور جن کو مشہور صوفیوں کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔ ذیل کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

فوائد الفواد: مورخہ ۱۵ محرم ۷۱۷ھ

"گفتگو مشائخ کی کتابوں اور ان ہدایات کے بارے میں جو مشائخ دیتے ہیں شروع ہوئی۔ ایک صاحب جو حاضر تھے انھوں نے عرض کیا کہ مجھے اودھ میں ایک کتاب دکھائی گئی اور کہا گیا کہ حضور نے اس کو لکھا ہے۔ شیخ نظام الدین نے فرمایا کہ اس نے غلط کہا ہے میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔"

خیر المجالس: مجلس یازدہم: حمید قلندر لکھتے ہیں:

"اس کے بعد ایک صاحب نے عرض کیا: ملفوظ خواجہ عثمان ہارونی میں ایک مشکل پیدا ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ جس نے دو مادہ گاؤ ذبح کیں، اس نے ایک آدمی کا خون کیا اور جس نے چار مادہ گاؤ ذبح کیں، اس نے دو آدمیوں کا خون کیا، جس نے دس بکریاں ذبح کیں اس نے ایک خون کیا اور جس نے بیس بکریاں ذبح کیں اس نے دو خون کیے۔ اول شیخ نصیر الدین نے فرمایا کہ صحیح لفظ ہارونی نہیں ہے بلکہ ہرونی ہے۔ ہرون ایک گاؤں ہے جہاں شیخ عثمان رہتے تھے۔ اور آپ ہی کے بارے میں یہ قول ہے الرجال فی القریٰ۔ بہت مشائخ اور مردانِ خدا گاؤں میں رہے ہیں۔ اس کے بعد شیخ نصیر الدین نے فرمایا کہ یہ ملفوظ شیخ عثمان کا نہیں ہے۔ اس کا نسخہ میرے پاس بھی ہے، اور اس میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو آپ کے اقوال سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ پھر آپ نے کہا کہ شیخ نظام الدین نے فرمایا ہے کہ میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی کیونکہ شیخ فرید الدین، شیخ قطب الدین اور دوسرے مشائخ چشت

جو میرے شجرے میں ہیں انھوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔ بندہ نے عرض کیا کہ فوائد الفواد میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے شیخ نظام الدین سے عرض کیا کہ میں نے آپ کی تصنیف کی ہوئی ایک کتاب ایک آدمی کے پاس دیکھی ہے اور شیخ نظام الدین نے جواب دیا کہ اس نے غلط کہا ہے میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے اور میرے سلسلے کے مشائخ نے بھی کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔ شیخ نصیر الدین نے کہا کہ ہاں شیخ نظام الدین نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔ پھر بندہ نے عرض کیا کہ یہ نسخے جو اس زمانے میں پیدا ہو گئے ہیں' ملفوظات شیخ قطب الدین اور ملفوظات شیخ عثمان ہرونی'' کیا یہ شیخ نظام الدین کے زمانے میں تھے؟ شیخ نصیر الدین نے فرمایا کہ نہیں۔ اگر ہوتے تو شیخ نظام نے حکم دیا ہوتا اور وہ آپ کے پاس لائے جاتے۔[1]

تمام غیر مستند کتابوں کا ذکر تو یہاں نہیں کیا جا سکتا لیکن حسب ذیل پانچ کتابیں جن کو چشتیہ سلسلے کے بزرگ مشائخ سے منسوب کیا جاتا ہے غیر مستند اور موضوع ہیں[2]

(۱) انیس الارواح۔ ملفوظات خواجہ عثمان ہرونی، منسوب بہ شیخ معین الدین اجمیری۔

(۲) دلیل العارفین۔ ملفوظات خواجہ معین الدین اجمیری، منسوب بہ شیخ

---

[1] صفحہ ۵۲-۵۳

[2] ان کے علاوہ ایک کثیر تعداد غیر مستند کتابوں کی چھپ گئی ہے۔ غیر مستند کتابوں کے نسخے بھی بہت کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

قطب الدین بختیار کاکی اوشی۔

(۳) فوائد السالکین۔ ملفوظات شیخ قطب الدین بختیار، منسوب بہ شیخ فرید الدین گنج شکر۔

(۴) راحت القلوب۔ ملفوظات شیخ فرید الدین، منسوب بہ شیخ نظام الدین اولیاء۔

(۵) راحت المحبین۔ ملفوظات شیخ نظام الدین اولیاء، منسوب بہ حضرت امیر خسرو۔

ان کتابوں میں اندرونی خامیاں بھی ہیں۔ ان کے لکھنے والے ہندستان اور عجم کی تاریخ سے بہت کم واقفیت رکھتے تھے۔ لیکن عوام الناس کی خواہش تھی کہ ان بزرگوں کی لکھی ہوئی کتابیں حاصل کریں اور اس مطالبے کو کتب فروشوں نے اپنی استطاعت کے مطابق پورا کیا۔

تیسری فصل۔ متفرق اطلاعات

سکہ۔ سلطنت دہلی میں چاندی کے سکّہ کو تنکہ کہتے تھے۔ پہلا تنکہ سلطان شمس الدین ایلتتمش کے زمانے میں رائج ہوا۔ سلطان علاء الدین کا تنکہ سب سے زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اس زمانے کے بہت تنکے بنارس یونی ورسٹی کے میوزیم میں دیکھے ہیں۔ وزن میں سلطنت دہلی کا تنکہ انگریزی زمانے کے روپے کے برابر ہوتا تھا لیکن اس میں چاندی کا حصہ زیادہ ہوتا تھا۔

سونے کے تنکے کا بھی ذکر آتا ہے لیکن غالباً سونے کا تنکہ عام طور سے بازار میں رائج نہ تھا، صرف خاص ضرورتوں کے لیے بنایا جاتا تھا۔

تانبے کے سکّے کو جیتل کہتے تھے۔ تنکہ اور جیتل دونوں بازار میں اپنی دھات کی قیمت کے مطابق رائج تھے۔ سلطنت کی طرف سے کوئی حکم نہ تھا اور نہ دارالضرب سے سلطنت کو کوئی خاص فائدہ ہوتا تھا۔ ایک چاندی کے تنکے میں کبھی زیادہ جیتل ملتے تھے اور کبھی کم۔ مورخ فرشتہ کا خیال ہے کہ عام طور سے ایک چاندی کے تنکے کے بدلے میں پچاس جیتل مل سکتے تھے۔

قیمتیں۔ مختلف اجناس کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی تھیں۔ سب سے سستا زمانہ سلطان علاءالدین خلجی کا تھا جس نے حکومت کی طرف سے بہت سی چیزوں کی قیمت مقرر کر دی تھی۔ خواجہ ضیاءالدین نے اس زمانے کی قیمتیں دی ہیں جس میں سے کچھ حسبِ ذیل ہیں:

گیہوں	۷½ جیتل فی من
جو	۴ جیتل فی من
چاول	۵ جیتل فی من
دال	۵ جیتل فی من
شکر (سفید)	۱۰۰ جیتل فی من
گھی	۱۶ جیتل فی من
سرسوں کا تیل	۱۴ جیتل فی من
گائے (دودھ دینے کے لیے)	۳ سے ۴ تنکہ فی گائے

اس زمانے میں من کا وزن مختلف مقامات پر مختلف ہوتا تھا۔ دہلی کا من غالباً آج کل کے بارہ سیر کے برابر ہوتا تھا۔

زمین کے ناپنے کے لیے بگھہ اور بسوہ استعمال کیے جاتے تھے؛ لیکن ان کا رقبہ ملک کے مختلف حصوں میں مختلف ہوتا تھا۔

القابِ شیخ نظام الدین اولیاء۔ حضور کو مختلف لوگوں نے مختلف القاب سے یاد کیا ہے۔ امیر حسن سجزی آپ کو ہمیشہ 'خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ آپ کے مرید آپ کو اکثر 'سلطان المشائخ' کہتے ہیں، لیکن شیخ جمالی نے 'سلطان المشائخ' عام طور سے سب بزرگ صوفیوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ لفظ اولیاء تو جمع ہے اس کو ایک شیخ کے لیے استعمال کرنا غلط ہے۔ لیکن شیخ نظام الدین اولیاء عام لوگوں کی زبان پر رائج ہو گیا ہے اور اس کو تبدیل کرنا مشکل ہے۔ میں نے عام طور سے لفظ 'حضور' استعمال کیا ہے لیکن کبھی کبھی اس خوف سے کہ شبہ نہ ہو جائے، آپ کا نام بھی استعمال کیا ہے۔ میں نہیں جانتا ہوں کہ خدا کے چنے ہوئے بندوں میں سے کون سلطان ہے اور کون نہیں ہے۔ لفظ 'حضور' سے میں صرف اپنے ذاتی اعتقاد کا اظہار کرتا ہوں۔ مشائخ کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔

بابِ اوّل

بداؤں شہر

شیخ نظام الدین اولیاءؔ نے بداؤں میں آنکھ کھولی تھی اور وہیں اُن کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس شہر کو عہدِ وسطیٰ کی تمدنی زندگی میں ایک خصوصیت حاصل تھی۔ یہاں مسلمانوں کی نوآبادیاں ترکوں کے سیاسی تسلّط سے بہت قبل قائم ہو گئی تھیں۔ ایسا کیونکر ہوا؟ اس تاریخی حقیقت کو سمجھنے کے لیے چند امور کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔

جب آخری عہدِ حجری کے انقلاب (نیولیتھک ریوولیوشن) نے انسانی تہذیب اور تمدن کی بنیاد ڈالی تو تقریباً تمام انسانی گروہوں کو اس کا احساس ہوا کہ وہ ان سب چیزوں کو نہیں پیدا کر سکتے تھے جو ان کی زندگی کے لیے ضروری ہو گئی تھیں۔ مثلاً کشمیر میں نمک نہیں پایا جاتا، جنوبی ایران میں روئی اور شکر نہیں پیدا کی جا سکتی۔ سب سے اچھی مثال آلاتِ حرب کی ہے۔ لوہے اور دوسری دھاتوں کی ضرورت تمام عالم کو ہے۔ لیکن یہ دھ[illegible]ت مخصوص مقامات پر پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا انسانی تہذیب کے

لیے

کوششوں کا نتیجہ ہے۔ بودھ مذہب کی اشاعت اتنے ایشیائی ملکوں میں ہوئی لیکن دوسری یا تیسری صدی عیسوی کے بعد ہندوؤں کا نقطۂ نظر بدل گیا اور اور منوسمرتی ایسی مذہبی کتابوں نے برہمنوں پر چند بہت سخت پابندیاں عاید کر دیں۔ ان کا فرض ہو گیا کہ ایسے ہی ملک میں رہیں جہاں مونج کی گھاس اگتی ہو اور جہاں سیاہ ہرن پائے جاتے ہوں۔ سمندر پار کرنا ان کے لیے بالکل ممنوع کر دیا گیا اور ان کو تنبیہ کی گئی کہ ایسے ملک میں نہ جائیں جہاں کی حکومت چنڈال یا پنچ قوموں کے ہاتھ میں ہو۔ منوسمرتی نے یونانی، ترکی اور ایرانی باشندوں کو ان نیچ قوموں میں گنا ہے۔

ان رجعت پسند احکام کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی بین الاقوامی تجارت کلیتہً غیر ملکیوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ہندوستان کے تجارتی تعلقات عربستان اور شمالی ممالک سے بہت پرانے ہیں۔ جب ان ممالک میں اسلامی حکومتیں قائم ہو گئیں تو ہندوستان کی بین الاقوامی تجارت مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس تجارت سے ہندوستان کا بہت فائدہ تھا۔ اشیاء برآمد مالِ درآمد سے بہت زیادہ تھیں اور ہندوستان کو اس کی پیداوار کے بدلے میں سونا اور چاندی ملتا تھا۔ بیرونی تجار روئی اور شکر کے لیے وہ قیمت دے سکتے تھے جو ہندوستانی سیٹھوں کے لیے ناممکن تھا۔ ہندو راجہ اس کے خواہش مند تھے کہ مسلمان تاجران کے دیش میں سکونت اختیار کریں لیکن ہندو دھرم ان کو اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ اچھوت قوموں کو اپنے محفوظ شہروں کے اندر سکونت کرنے دیں۔ اب اسلامی مذہب کے ارکان بھی کچھ ایسے ہیں کہ ان کا مستحکم رہنا بغیر ایک جماعت کے مشکل ہے، اس لیے چند بڑے شہروں کے راجاؤں نے ان کو شہر کی فصیل کے باہر اتنی زمین دے دی کہ وہ اس میں

اپنی بستیاں قائم کر سکیں۔ ان بستیوں میں انھوں نے اپنے مکانات، گودام وغیرہ بنائے اور کچھ زمین اپنے قبرستان کے لیے الگ کر دی۔ بستی کا مرکز اس کی مسجد تھی، جہاں پانچ وقت کی نمازوں کے علاوہ لڑکوں کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ اس طرح یہاں اسلامی تہذیب کی داغ بیل پڑی۔ عرب تاجروں کے بیانات اور تحفۃ المجاہدین[1] جیسی پرانی کتابوں میں ان بستیوں کا ذکر ملتا ہے۔ غوری حملوں سے پہلے شمالی ہندوستان کا سب سے مشہور شہر قنوج تھا، اور وہاں مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی بستی تھی[2]۔ اس زمانے کے تمام مذہبی اور سیکولر علوم عربی زبان میں تھے، اس لیے ہر اسلامی بستی کے لیے ضروری تھا کہ وہاں اچھے پایے کا عربی علم حاصل کرنے والے ہوں۔

بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی کی جنگ و جدال میں یہ اسلامی بستیاں یا تو غائب ہوگئیں یا آس پاس کے شہروں سے ملحق کر دی گئیں۔ اور اب ان کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا۔ صرف ایک بستی بداؤں ایسی ہے جس کا کچھ حال شیخ نظام الدین اولیاء کے بیانات میں ملتا ہے۔ ان بیانات کو سمجھنے کے لیے یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کہ معز الدین غوری سے لے کر علاء الدین خلجی کے زمانے تک حکمراں طبقہ بالکل ترکی النسل تھا۔ علاء الدین خلجی نے اپنے جلوس کے دوسرے یا تیسرے سال اس طبقے کو بالکل ختم کر دیا تھا[3] اور غیر ترک بھی حکومت کے عہدوں پر مقرر کیے جانے لگے تھے، لیکن

---

[1] مطبوعہ مدراس یونی ورسٹی، بہ تصحیح پروفیسر محمد علی نینار۔

[2] تاریخ قنوج (انگریزی) مصنفہ ڈاکٹر آر۔ ایس ترپاٹھی۔

[3] علاء الدین خلجی ۱۲۹۶ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس کے چچا جلال الدین خلجی نے غیر ترکوں کو چند

(باقی ص ۲۴ پر)

تیرھویں صدی عیسوی میں کسی ہندوستانی مسلمان کو کوئی بڑا عہدہ دینا آئینِ حکومت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

امیر خورد نے شیخ نظام الدین اولیاء کا سال ولادت ۶۳۶ھ (مطابق ۱۲۳۸ء) دیا ہے۔ وہ اکثر اپنی مجلسوں میں بداؤں کے مشہور لوگوں کا ذکر کرتے تھے۔ اگر ان سب بیانات کو یکجا کر لیا جائے تو بداؤں کی اس علمی اور تہذیبی فضا کی ہلکی سی جھلک ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ جس میں شیخ کی ابتدائی ذہنی اور اخلاقی تربیت ہوئی تھی۔ خاص طور پر انھوں نے تین بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں دو تو آپ سے پہلے گزرے تھے اور تیسرے آپ کے استاد تھے۔ ان بزرگوں کا حال خود شیخ کی زبانی سنیے جو اُن کے مرید حسن سجزی دہلوی نے قلمبند کیا ہے۔

مولانا رضی الدین صنعانی[1] "اس کے بعد گفتگو مولانا رضی الدین صنعانی صاحب مشارق الانوار[2] کی فضیلت اور ان کے اس جملے کے بارے میں ہوئی کہ 'یہ کتاب میرے اور خدا کے درمیان حجت ہے۔' (فرمایا) اگر اُن کو کسی حدیث میں دقت پیش آتی تو وہ رسول خدا کو خواب میں دیکھتے اور (آپ سے) حدیث کو صحیح کر لیتے۔ پھر

(ص ۲۳ سے آگے) اعلیٰ عہدے دیئے تھے۔ علاء الدین خلجی نے ان ترکی خاندانوں کو ختم کر دیا۔ یہاں ترک سے ترک اقوام مراد نہیں ہیں بلکہ صرف وہ ترکی غلام جن کو معز الدین غوری اور شمس الدین نے اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا تھا اور جن کی اولاد حکومت ہندوستان کو اپنی موروثی ملکیت سمجھنے لگی تھی۔

[1] فوائد الفواد، ۲۲ رجمادی الثانی ۷۱۳ھ

[2] اس میں صحیحین یعنی مسلم اور بخاری سے احادیث کا انتخاب کیا گیا ہے۔ کتاب اب بھی عربی مدارس میں رائج ہے۔

آپ نے فرمایا کہ وہ بداؤں کے تھے، وہاں سے کول (علی گڑھ) آگئے اور یہاں نائب مشرف[1] کے عہدے پر اُن کا تقرر ہوگیا۔ جس مشرف کے ساتھ مولانا مقرر ہوئے تھے وہ بھی اہل تھا، لیکن ایک دن اس نے کچھ ایسی بات کہی کہ مولانا (بے اختیار) مسکرادیے۔ مشرف نے (غصے میں) دوات ان کی طرف پھینک دی۔ مولانا ذرا ہٹ گئے اور روشنائی ان تک نہ پہنچ پائی۔ لیکن مشرف کی یہ حرکت دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ وہ ان کا مخالف ہوگیا ہے، اپنی جگہ پر کھڑے ہوگئے اور کہا کہ اب مجھے جاہلوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا نہ چاہیے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے علم میں اضافے کی کوشش کی۔ (اسی دوران میں) کول کے والی (گورنر) کے بیٹے کے معلّم مقرر ہوگئے اور سو تنکہ (سالانہ) جو ان کو ملتے تھے اس پر قانع رہے۔ کول سے وہ حج کو گئے اور وہاں سے بغداد گئے اور اس کے بعد پھر حضرت[2] دہلی واپس آئے۔ اس وقت حضرت دہلی میں بڑے پایے کے عالم موجود تھے۔ اور علوم میں مولانا صغانی دوسرے علما کے برابر تھے لیکن علم حدیث میں وہ سب سے بڑھے ہوئے تھے اور کوئی ان کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔

اس کے بعد شیخ نے زبان مبارک سے فرمایا کہ ان کا کام ایک وجہ سے آگے بڑھا۔ جب انھوں نے کول سے حج کا ارادہ کیا تو ایک نیا جوتوں کا جوڑا خریدا اور پہنا، لیکن ابھی ایک منزل طے کی تھی کہ اس قدر تھکن محسوس کرنے لگے کہ ان کو یقین ہوگیا کہ پیادہ پا سفر نہیں کرسکتے۔ اسی خیال میں تھے کہ

---

[1] مشرف کا شعبہ حسابات رکھتا تھا۔ حسابات کے جانچنے (آڈٹ) کا ایک اور شعبہ تھا جس کو مستوفی کہتے تھے۔

[2] شہر دہلی کو اس زمانے میں حضرت دہلی کہتے تھے یا صرف حضرت۔

والیِ کوُنل کا بیٹا اُن کو واپس لے جانے کے لیے گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔ جب وہ قریب پہنچا تو مولانا نے دیکھا کہ وہ بہت اچھے گھوڑے پر سوار ہے۔ ان کے دل میں خیال آیا کہ اگر یہ گھوڑا مجھے دے دے تو میں آسانی سے سفر کر سکتا ہوں۔ والی کے بیٹے نے ان کے واپس جانے پر بہت اصرار کیا، لیکن مولانا راضی نہ ہوئے۔ جب اس نے دیکھا کہ مولانا کا واپس ہونا ناممکن ہے تو عرض کیا کہ اس گھوڑے کو قبول کر لیجیے۔ مولانا نے گھوڑا لے لیا اور روانہ ہو گئے۔

حج کے بعد مولانا بغداد پہنچے۔ بغداد میں ابن زہری نامی ایک محدث تھے۔ ان کے لیے ایک منبر بنایا گیا تھا جس پر بیٹھ کر وہ درسِ حدیث دیتے تھے۔ ان کی مجلس میں علما حاضر ہوتے تھے اور حلقہ کر کے بیٹھتے تھے۔ یہاں تک کہ کئی حلقے ان کے گرد ہو جاتے تھے۔ پہلے حلقے میں اونچے درجے کے علما بیٹھتے تھے، دوسرے حلقے میں جو اُن سے کمتر ہوتے۔ اور اسی طرح حلقے کے بعد حلقہ (ہوتا تھا اور علی قدر مراتب علماء بیٹھتے تھے)۔ ابن زہری حدیثیں لکھاتے تھے اور حاضرین لکھتے تھے۔

ایک دن مولانا رضی الدین ان کی مجلس میں حاضر ہوئے اور آخری حلقے میں بیٹھ گئے۔ ابن زہری موذّن سے موافقت کرنے کی حدیث بیان کر رہے تھے یعنی جب موذّن کی آواز ختم ہو جائے تو سننے والے کو کیا کرنا چاہیے۔ آغازِ حدیث ابن زہری نے اِن الفاظ سے کیا :

اِذَا سَکَبَ الْمُؤَذِّنُ

سکوب کے معنی پانی چھڑکنے کے ہیں، یعنی جب موذّن کی آواز تمھارے کانوں تک پہنچے تو تم کو وہی کلمات کہنے چاہیے جو اس نے کہے ہیں۔ جب ابن زہری

شیخ نظام الدین اولیا نے مولانا رضی الدین صغانی کی کوئی تاریخ نہیں دی ہے، لیکن خود انھوں نے جس بزرگ سے درسِ حدیث لیا تھا یعنی مولانا کمال الدین زاہد، وہ مولانا رضی الدین کے شاگرد تھے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ مولانا صغانی قطب الدین ایبک اور ایلتتمش کے ہمعصر تھے۔ بداؤں کی اسلامی بستی ہندو راجاؤں کے زمانے میں قائم ہو گئی ہوگی، ورنہ وہاں ملخص پڑھانے والے اساتذہ نہ ہوتے۔ غالب جب قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۴ء میں کول فتح کیا، تو وہاں ایک پڑھے لکھے گروہ کی ضرورت ہوئی۔ جو حکومت کے حسابات اور دوسرے کاروبار کا انتظام کر سکے۔ علماء کے جس گروہ کی طرف شیخ کبیر نے ارشاد کیا ہے وہ صرف ایلتتمش ہی کے زمانۂ حکومت میں جمع ہوا تھا

دوسرے بزرگ جن کا حال بداؤں کی فضا کو سمجھنے میں معاون ہو سکتا ہے، شیخ جلال الدین تبریزی ہیں۔ اُن کے بارے میں سیر العارفین نے کچھ قصّے تفصیل سے بیان کیے ہیں، لیکن یہ کتاب تین سو برس کے بعد کی ہے، اور اس میں کچھ ایسے واقعات درج کیے گئے ہیں جن کی کوئی سند نہیں ہے۔ لیکن شیخ نظام الدین اولیاء نے دہلی اور بداؤں میں قابلِ اعتماد لوگوں سے شیخ تبریزی کے بارے میں سُنا ہوگا۔ اپنے اصول کے مطابق انھوں نے اس جھگڑے کے بارے میں جو شیخ جلال الدین تبریزی اور شیخ نجم الدین صغریٰ کے درمیان ہوا تھا، صرف اشارہ کیا ہے۔

فوائد الفواد کے بیانات حسب ذیل ہیں :

ایک نوجوان آیا۔ شیخ کبیر (شیخ نظام الدین اولیاء) نے اس سے پوچھا

ح رضوی: دہلی۔ صفحہ ۹۴ تا ۱۰۱۔

تمھارے دادا کس پیر کے مرید تھے۔ اس نے جواب دیا: شیخ جلال الدین تبریزی کے۔ فرمایا: شیخ جلال الدین بہت کم مرید کرتے تھے اور یہی قاعدہ قاضی حمید الدین ناگوری کا بھی تھا (۲۳ ذیقعد ...ھ)"

"اس کے بعد ذکر شیخ جلال الدین تبریزی کا ہوا۔ فرمایا: میں نے ایک خط کی نقل جو انھوں نے عربی میں شیخ بہاء الدین زکریا کو بھیجا تھا، دیکھی ہے۔ اس میں انھوں نے یہ جملہ نقل کیا تھا: مَنْ اَحَبَّ انجاء النّساء لایُفلح ابداً" ضیعہ کا ذکر بھی کیا تھا۔ ضیعہ کہتے ہیں زمین، کھیت، گاؤں وغیرہ کو۔ لفظ عربی مجھے یاد نہیں ہیں لیکن اس کے معنے یہ ہیں کہ جس نے اپنا دل زمین (جائداد) سے لگایا، تم کہہ سکتے ہو کہ وہ دنیا یعنی اہلِ دنیا کا غلام ہو گیا ہے۔ بندے نے پوچھا کہ شیخ جلال الدین کس کے مرید تھے؟ آپ نے جواب دیا کہ شیخ ابوسعید تبریزی کے مرید تھے۔" (۹ جمادی الاول ۷۱۲ھ)

"اس کے بعد آپ نے یہ حکایت بیان کی کہ ایک دفعہ شیخ شہاب الدین سہروردی سفرِ حج سے واپس آئے۔ بغداد کے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہر شخص کچھ نذرانہ لایا اور بہت نقد و جنس جمع ہو گئی۔ اسی درمیان میں ایک بڑھیا آئی اور اپنی پیوند لگی گدڑی کھول کر اس نے ایک درہم شیخ شہاب الدین کے سامنے رکھ دیا۔ شیخ نے یہ درہم اٹھا کر اور سب ہدیوں اور تحفوں کے اوپر رکھ دیا۔ پھر آپ نے حاضرینِ محفل سے کہا کہ تم کو جو کچھ ان ہدیوں اور تحفوں میں اچھا معلوم ہو اس کو لے لو۔ ہر شخص اٹھا اور نقد کی تھیلی یا اچھے کپڑے اٹھا لیے۔ شیخ جلال الدین تبریزی وہاں حاضر تھے۔ ان کو بھی اشارہ ہوا کہ تم کچھ لے لو۔ آپ کھڑے ہوئے اور وہ درہم اٹھا لیا جو بڑھیا لائی تھی۔ شیخ شہاب الدین نے یہ دیکھ کر کہا کہ تم سب کچھ لے گئے۔"

"بندے نے یہ سن کر دریافت کیا کہ کیا شیخ جلال الدین شیخ شہاب الدین کے مرید تھے؟ آپ نے فرمایا، نہیں، وہ شیخ ابوسعید تبریزی کے مرید تھے۔ لیکن جب ان کے پیر کا انتقال ہو گیا تو وہ شیخ شہاب الدین کے پاس آئے اور ان کی ایسی خدمت کی کہ کوئی غلام اور مرید بھی نہیں کر سکتا۔ کہتے ہیں کہ شیخ شہاب الدین بڈھے اور ضعیف ہو گئے تھے، اور وہ خشک کھانا جو لوگ سفر میں لے جاتے ہیں اُن کے موافق نہ آتا تھا۔ شیخ جلال الدین نے ایک ایسی انگیٹھی اور انگیٹھی پر رکھنے کو ایک ایسی پتیلی بنائی کہ جب وہ (جلتی ہوئی) انگیٹھی کو اپنے سر پر لے کر چلیں تو ان کا سر نہ جلے۔ چنانچہ جب بھی شیخ شہاب الدین کھانا مانگتے تھے تو وہ ان کے سامنے گرم کھانا پیش کرتے تھے۔"

"پھر شیخ کبیر (نظام الدین اولیاء) نے شیخ ابوسعید تبریزی کی بزرگی کا ذکر کیا۔ فرمایا کہ وہ بہت بڑے شیخ تھے اور ترکِ دنیا میں بہت سخت تھے۔ کسی سے کچھ نہ لیتے تھے اور اکثر انھیں فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ ان کی خانقاہ میں تین دن تک کچھ کھانا نہ پکا اور آپ کے یار خربوزہ اور تربوز (ہندوانہ) پر افطار کر کے زندگی بسر کرتے رہے۔ جب یہ خبر والیٔ شہر تبریز کو پہنچی تو اس نے اپنے حاجب سے کہا کہ چونکہ شیخ مجھ سے کوئی چیز قبول نہ کریں گے تم یہ رقم (جو چاندی کے سکوں پر مشتمل تھی) لے جاؤ اور شیخ کے خادم سے کہو کہ اس کو رفتہ رفتہ صرف کرے اور شیخ سے کچھ نہ کہے۔ حاجب آیا اور رقم خادم کو دی اور نصیحت کی کہ اس رقم کو جس طرح مناسب سمجھو خرچ کرو لیکن شیخ سے نہ کہو کہ یہ رقم کہاں سے آئی ہے۔ القصہ خادم نے رقم کو لیا اور خرچ کیا، لیکن اس روز شیخ کو وہ ذوق اور راحت جو عبادت میں

ملتی تھی نہ ملی۔ آپ نے خادم کو بلایا اور پوچھا کہ وہ کھانا جو تم میرے لیے لائے تھے کس رقم سے آیا تھا؟ خادم کسی چیز کو چھپا نہ سکا اور سب کچھ بیان کر دیا۔ شیخ نے دریافت کیا کہ یہ رقم لانے والا کس طرف سے آیا تھا اور اس کے قدم کہاں کہاں پڑے تھے۔ پھر حکم دیا کہ جہاں اس کے قدم پڑے تھے زمین کو کھود ڈالیں اور مٹی کو باہر لے جا کر ڈال دیں۔ خادم کو مع اس رقم کے جو اُس نے لی تھی، خانقاہ سے نکال دیا گیا۔" (۲۳ رشعبان ۷۱۰ھ)

یہ واقعہ غالباً علاء الدین محمد خوارزم شاہ کے دور حکومت (۱۲۰۰ء تا ۱۲۱۸ء) کا ہے۔ خوارزم شاہی حکومت بہت وسیع تھی۔ یعنی بغداد کی سرحد سے شروع ہو کر ترکستان تک پہنچتی تھی، لیکن خوارزم شاہ کی والدہ کی وجہ سے ترکانِ قبچاق نے ظلم وجور کی انتہا کر دی تھی۔ صوفیائے کرام نے فتوح کے بارے میں بہت سخت اصول بنائے تھے، لیکن ان اصولوں کے مطابق شیخ ابوسعید تبریزی کے لیے ضروری نہ تھا کہ جو ہدیہ والیِ تبریز نے بھیجا تھا اس کو قبول نہ کرتے۔ اُن کی روش سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایسی ظالمانہ حکومت سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

شیخ شہاب الدین کی اجازت لے کر شیخ جلال الدین تبریزی ہندستان کی طرف روانہ ہوئے۔ حسن سجزی لکھتے ہیں: "شیخ کبیر (نظام الدین اولیاء) نے فرمایا کہ شیخ جلال الدین تبریزی خواجہ فریدالدین عطار سے نیشاپور میں ملے تھے۔ انھوں نے شیخ بہاء الدین زکریا سے ایک مرتبہ نیشاپور کی ملاقات کا ذکر کیا اور کہا کہ شیخ فریدالدین عطار نے مجھ سے کہا کسی مردِ خدا کا نشان دو۔ میں کسی کا نام نہ لے سکا۔ شیخ بہاء الدین نے پوچھا کہ تم نے شیخ شہاب الدین کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ شیخ جلال الدین نے جواب دیا کہ اس

مشغولی کے مقابلے میں جو میں نے خواجہ فرید الدین میں پائی اور لوگوں کی عبادت اس کے مقابلے میں معزولی کے برابر تھی۔ (۷ر جمادی الاول ۷۲۱ھ)"

چنگیزی مغلوں نے ۱۲۲۰ء میں نیشاپور میں قتلِ عام کیا، جس میں شیخ فرید الدین عطار اور ان کے سب مرید شہید ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ ملاقات ۱۲۲۰ء سے پہلے ہوئی ہو گی۔

شیخ قطب الدین (بختیار کاکی) کی بزرگی کے بارے میں شیخ کبیر (نظام الدین اولیاء) نے فرمایا کہ ایک وقت شیخ بہاء الدین زکریا اور شیخ جلال الدین تبریزی اور شیخ قطب الدین بختیار ملتان میں تھے۔ مغلوں کا لشکر ملتان کے مینار کے نیچے تک پہنچ گیا۔ قباچہ اس زمانے میں ملتان کا والی تھا۔ شیخ قطب الدین نے رات کو ایک تیر قباچہ کو دیا اور کہا کہ اس تیر کو اندازہ کر کے کافروں کے لشکر کی طرف پھینکو۔ قباچہ نے ایسا ہی کیا۔ جب صبح ہوئی تو وہاں ایک کافر بھی نہ تھا۔ سب چل دیے تھے۔" (۱۴ر رجب ۷۱۳ھ) یہ ۱۲۲۰ء کا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ چنگیز خاں نے خود دریائے سندھ پار نہیں کیا، لیکن اپنے فوجی افسروں کو لوٹ مار کے لیے ہندوستان بھیجا تھا۔ ایک چنگیزی فوج نے ملتان کا محاصرہ کیا۔ مورخ کہتے ہیں کہ گرمی کی شدت کی وجہ سے چنگیزی افسروں نے طے کیا کہ واپس چلے جائیں۔

اس کے بعد شیخ کبیر نے فرمایا کہ شیخ جلال الدین تبریزی دہلی آئے اور کچھ زمانے کے بعد یہاں سے روانہ ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں اس شہر میں آیا تو خالص سونا تھا، اس وقت چاندی ہو گیا ہوں۔ آئندہ معلوم نہیں کیا ہو جاؤں گا۔ (۱۱ر ذی الحجہ ۷۱۳ھ)

تھوڑی گفتگو اس پر ہوئی کہ شیخ قطب الدین بختیار نے شیخ جلال الدین تبریزی کو اپنے گھر مہمان بلایا۔ شیخ قطب الدین کا گھر کیلو کھڑی کے حدود پر تھا

آپ اپنے گھر سے شیخ جلال الدین کے استقبال کو نکلے لیکن چوڑی سڑکوں کو چھوڑ کر تنگ کوچوں سے چلے۔ شیخ جلال الدین نے بھی اسی طرح کیا۔ بالآخر دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ شیخ کبیر نے ان دونوں بزرگوں کی ایک دوسری ملاقات کا بھی ذکر کیا۔ جو ملک عزّ الدین کی مسجد میں ہوئی تھی جو اس کے حمام کے سامنے ہے۔
(۲۷ ذیقعد ۷۱۵ھ)

پھر شیخ کبیر نے فرمایا کہ قاضی کمال الدین جعفری، بداؤں کے حاکم، باوجود شغل قضا اور دوسرے کاموں کے اوراد اور قرآن بہت پڑھا کرتے تھے۔ جب بڈھے ہو گئے تو ان سے یہ عبادت نہ ہو سکی۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا کیا حال ہے۔ جواب دیا کہ مسبعات عشر پر قناعت کر رہا ہوں کیونکہ یہ تمام اوراد کا خلاصہ ہیں (۲۴ شوال ۷۱۹ء) لیکن شیخ جلال الدین تبریزی سے مٹ بھیڑ کے وقت قاضی اتنے بڈھے نہ تھے مگر جیسا کہ ہم دیکھیں گے وہ غالباً دہلی کے واقعات سے واقف تھے اور ایک بزرگ صوفی سے جھگڑا کرنا ان کی طبیعت میں نہ تھا۔

کبھی شیخ جلال الدین تبریزی کا ذکر ہوا۔ شیخ کبیر (نظام الدین اولیا) نے فرمایا کہ بداؤں پہنچنے کے بعد آپ نے کچھ زمانے تک وہاں قیام کیا۔ ایک دن کسی مصلحت سے حاکم بداؤں قاضی کمال الدین جعفری کے دروازے پر پہنچے۔ قاضی کے خدمتگاروں نے جو وہاں بیٹھے تھے، کہا کہ اس وقت قاضی نماز پڑھ رہے ہیں۔ شیخ جلال الدین نے مسکرا کر کہا۔ کیا قاضی نماز پڑھنا جانتے ہیں؟ شیخ یہ کہہ کر واپس چلے آئے لیکن قاضی کو خبر پہنچی کہ شیخ نے یہ کہا ہے۔ دوسرے دن قاضی کمال الدین، شیخ کی خدمت میں آئے اور معذرت کرنا شروع کیا اور اس کے بعد پوچھا کہ آپ نے یہ کیوں دریافت کیا کہ قاضی نماز پڑھنا جانتے ہیں۔ میں نے نماز اور اس کے احکام پر چند کتابیں لکھی ہیں۔ شیخ نے کہا۔ ہاں نمازِ علماء، نمازِ فقراء سے مختلف ہوتی ہے۔

قاضی نے پوچھا کہ کیا فقرا رکوع اور سجدہ دوسری طرح سے کرتے ہیں یا قرآن دوسری طرح سے پڑھتے ہیں؟ شیخ نے جواب دیا، نہیں، علماء کی نماز یہ ہوتی ہے کہ کعبے کو دیکھیں اور اس کی طرف نماز پڑھیں۔ اگر کعبے پر ان کی نظر نہیں پہنچ سکتی ہے تو اس کی سمت میں نماز پڑھتے ہیں، اگر سمت بھی نہ معلوم ہو تو ایک مناسب رُخ چُن لیتے ہیں۔ قبلۂ علماء ان ہی تین قسموں کا ہوتا ہے۔ لیکن فقرا جب تک عرش کو نہ دیکھیں، نماز نہیں پڑھتے؛ گو قاضی کمال الدین کو یہ الفاظ گراں گزرے، لیکن انھوں نے کچھ نہیں کہا اور واپس چلے گئے۔ جب رات ہوئی تو قاضی کو خواب میں دکھایا گیا کہ شیخ جلال الدین تبریزی عرش پر مصلّا بچھا کر نماز پڑھ رہے ہیں۔ دوسرے دن دونوں بزرگ ایک محفل میں ملے اور شیخ جلال الدین نے گفتگو شروع کی: اے قاضی! علماء کا کام اور ان کا مرتبہ معلوم ہے۔ ان کی سب سے بڑی ہمت تدریس کی ہوتی ہے، چاہتے ہیں کہ مدرس ہو جائیں یا قاضی ہو جائیں یا صدر جہاں ہو جائیں۔ ان کا مرتبہ اس سے بڑھ کر نہیں ہے۔ لیکن درویشوں کے مراتب بہت ہیں اور ان کا پہلا رتبہ یہ ہے جو تم کو کل رات دکھایا گیا۔ قاضی کمال الدین یہ سُن کر اُٹھے۔ شیخ سے کمال معذرت کی اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ پھر اپنے بیٹے کو جس کا برہان الدین نام تھا، قاضی نے شیخ کے قدموں پر ڈالا اور مرید کرایا۔ اور اس نے شیخ سے کلاہ حاصل کی۔

(۶ رجب ۷۲۰ھ)

اس نماز جنازہ کے بارے میں شیخ کبیر نے شیخ جلال الدین تبریزی کی حکایت بیان کی۔ ان کے دہلی آنے کے بعد دہلی کے شیخ الاسلام شیخ نجم الدین صغری نے ان سے جھگڑا شروع کیا اور ایسے حالات پیدا کیے کہ شیخ جلال الدین کو ہندوستان کی طرف روانہ کیا گیا۔ بداؤں پہنچنے کے بعد وہ ایک دن دریا کے سوتہ

کے کنارے بیٹھے تھے۔ اک دم کھڑے ہو گئے، پھر سے وضو کیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ آؤ شیخ الاسلام[1] دہلی کی نماز جنازہ پڑھیں۔ ان کا اسی وقت انتقال ہوا ہے نماز پڑھنے کے بعد انھوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف مُنہ کیا۔ اور کہا کہ اگر شیخ الاسلام دہلی نے مجھے دہلی سے نکالا تو میرے شیخ نے ان کو دنیا سے نکالا ہے (۱۰ ار رمضان ۶۸۵ھ)

کچھ ذکر شیخ جلال الدین تبریزی کا ہونے لگا۔ شیخ کبیر نے فرمایا کہ بداؤں پہنچے کے بعد وہ ایک دن اپنے دہلیز خانہ[2] میں بیٹھے تھے۔ ایک دہی بیچنے والا دہی کی ہانڈی اپنے سر پر رکھے ہوئے سامنے سے گزرا۔ وہ ایک گاؤں (مواس[3]) کا جو بداؤں کے نزدیک ہے اور جس کو کاٹھیر[4] کہتے ہیں، رہنے والا تھا۔ یہاں بہت ڈاکو (قطاع الطریق) رہتے تھے اور یہ دہی بیچنے والا بھی حقیقۃً ڈاکو ہی تھا۔

---

[1] قاضیوں کا اصل کام مقدموں کا فیصل کرنا تھا۔ صدر جہاں ایک مرکزی افسر تھا، جو اپنے نائبوں کے ذریعہ مذہبی معاملات (علماء کی مدد معاش، مساجد کی تعمیر وغیرہ) کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ شیخ الاسلام صرف ایک لقب تھا جو بادشاہ کی طرف سے ملک کے سب سے بزرگ شیخ کو دیا جاتا تھا لیکن شیخ الاسلام کی بزرگی کا اعتراف کرنا یا اس کو رد کرنا مسلم ملت کے ہاتھ میں نہ تھا۔ سلطنت دہلی کی تین صدیوں میں صرف شیخ بہاء الدین زکریا ایسے شیخ الاسلام ہوئے ہیں جن کی بزرگی عام مسلمانوں اور صوفی حلقوں نے تسلیم کی ہے۔

[2] دہلیز خانہ سے مکان کا وہ کمرہ مراد ہے جس کا ایک دروازہ مکان کے اندر یا حرم سرا میں کھلتا تھا اور دوسرا سڑک پر۔

[3] مواس اس گاؤں کو کہتے تھے جس کی حفاظت کے لیے فصیل، خندق وغیرہ بنائی گئی ہوں۔

[4] کچھ کتابت کی غلطی ہے، کاٹھیر اس زمانے میں روہیل کھنڈ کو کہتے تھے۔ وہ اپنے راجپوتوں کی وجہ سے مشہور تھا۔

جب اُس نے شیخ جلال الدین کے روئے مبارک کو دیکھا تو پہلی ہی نظر میں اس کا دل بدلنا شروع ہو گیا۔ پھر اُس نے شیخ کو تیز نظر سے دیکھا اور کہا: کیا ایسے لوگ دینِ محمدی میں بھی ہوتے ہیں؟ (یہ کہہ کر) فوراً ایمان لے آیا۔ شیخ نے اس کا نام "علی" رکھ دیا۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ اپنے مکان گیا اور واپس آکر ایک لاکھ جیتل شیخ کی خدمت میں پیش کیے، شیخ نے ان کو قبول کیا اور کہا کہ اس رقم کو تم اپنے پاس رکھو اور جہاں میں کہوں خرچ کرو۔ فی الجملہ اس رقم سے شیخ کسی کو سو جیتل دیتے تھے اور کسی کو پچاس۔ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ۔ لیکن کم سے کم بخشش شیخ کی پانچ جیتل ہوتی تھی۔ کچھ زمانے کے بعد تمام رقم خرچ ہو گئی اور صرف ایک جیتل رہ گیا۔ یہ علی کہتے تھے کہ میرے دل میں خیال آیا کہ میرے پاس ایک جیتل ہے زیادہ نہیں اور شیخ کی سب سے چھوٹی بخشش پانچ جیتل کی ہوتی ہے۔ اگر کسی کو کچھ دینا چاہیں گے تو میں کیا کروں گا۔ میں اسی خیال میں تھا کہ ایک مانگنے والا آیا اور سوال کیا۔ شیخ نے مجھ سے کہا کہ اس کو ایک جیتل دے دو۔"

شیخ جلال الدین کے مناقب میں شیخ (نظام الدین اولیا) نے یہ بھی بیان کیا کہ جب وہ بداؤں سے لکھنوتی کے لیے روانہ ہوئے تو یہ علی بھی ان کے ساتھ چلے۔ شیخ نے کہا کہ تم واپس جاؤ۔ علی نے جواب دیا کہ میں کس کے پاس واپس جاؤں، میرے پاس کون ہے اور میں کس کو جانتا ہوں؟ جب تھوڑی دور اور چلے تو شیخ نے پھر کہا کہ تم واپس جاؤ اور یہ شیخ علی نے پھر جواب دیا کہ آپ میرے پیر اور مخدوم ہیں، بغیر آپ کے میں یہاں کیا کروں گا۔ شیخ نے حکم دیا کہ تم واپس جاؤ۔ یہ شہر تمھاری حمایت میں ہے (۲۷ صفر ۷۱۵ھ)

شیخ کبیر (نظام الدین اولیاء) نے فرمایا کہ کسی نے شیخ جلال الدین تبریزی

سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص سحری کھائے اور روزہ نہ رکھے تو اس کا سحری کھانا کیسا ہوگا۔ آپ نے جواب دیا کہ سحر کو کھائے، دن میں کھائے اور رات کے وقت کھائے، اور اس قوت کو جو اس غذا سے حاصل ہوتی ہے، خدا کی طاعت میں صرف کرے اور گناہ نہ کرے۔ (۱۶ ربیع الآخر ۷۱۰ھ)۔

اب بداؤں کے ایک ایسے بزرگ عالم کا حال سنیے جس کے سامنے شیخ نظام الدین اولیاء نے زانوے تلمذ تہ کیا تھا اور جن سے عقیدت اور محبت کا اظہار وہ اکثر اپنی محفلوں میں کرتے تھے۔ یہ تھے مولانا علاء الدین اصولی۔

(۳) مولانا علاء الدین اصولی۔ حسن سجزی لکھتے ہیں: "پھر مولانا علاء الدین اصولی کے مناقب پر گفتگو ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ بڑے بزرگ آدمی تھے لیکن کسی پیر کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ اگر کسی پیر کے مرید ہوتے تو شیخ کامل حال ہوتے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اپنے لڑکپن میں مولانا علاء الدین اصولی بداؤں کے ایک کوچے سے گزر رہے تھے۔ شیخ جلال الدین تبریزی اپنے دہلیز خانہ میں بیٹھے تھے، جب شیخ کی نظر مولانا پر پڑی تو آپ نے ان کو بلایا اور جو جامہ خود پہنے ہوئے تھے وہ ان کو پہنا دیا۔ شیخ کبیر نے فرمایا کہ مولانا کے تمام اوصاف اسی برکت سے تھے۔ (۹ رشوال ۷۱۶ھ)"۔

پھر شیخ کبیر نے ایک حکایت بیان کی کہ مولانا موصوف کے پاس ایک نو خریدہ بڑھیا لونڈی تھی۔ ایک صبح کو مولانا جاگے اور دیکھا کہ بڑھیا آٹا پیس رہی ہے اور روتی جاتی ہے۔ مولانا نے پوچھا کہ کیوں رو رہی ہو۔ اس نے جواب دیا کہ کاٹھیر گاؤں میں اپنا بیٹا چھوڑ آئی ہوں۔ اس کی جدائی میں روتی ہوں۔ مولانا نے پوچھا کہ اگر تمھیں کاٹھیر کے راستے پر اس حوض تک لے جاؤں جو شہر سے ایک کروہ (کوس) ہے تو وہاں سے اپنے مکان کا راستہ جانتی ہو؟

اس نے کہا، ہاں، جانتی ہوں۔ سحر کے وقت مولانا اس کو حوض تک لے گئے۔ اور وہاں چھوڑ دیا۔ یہ کہنے کے بعد شیخ کبیر (نظام الدین اولیاء) کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں اور فرمایا کہ علماءِ ظاہر ان باتوں (کی خوبی) کے منکر ہیں، لیکن یہ سمجھنا ممکن ہے کہ مولانا نے کیا کیا۔"

تھوڑی گفتگو مولانا موصوف کی دانشمندی پر ہوئی اور اس پر کہ وہ بحث میں انصاف پر نظر رکھتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی مشکل لفظ ہوتا یا کسی نکتہ کو اس طرح سمجھاتے کہ مجھے اطمینان نہ ہوتا کہ اس کے تمام معنی حل ہو گئے ہیں، تو اس بحث کو کسی اور وقت کے لیے ملتوی کر دیتے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کیسی انصاف کی بات ہے۔"

اسی ضمن میں شیخ (نظام الدین اولیاء) نے یہ حکایت بیان کی کہ ایک وقت میں مولانا علاء الدین اصولی کے ساتھ ایک کتاب کے نسخوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ ایک نسخہ ان کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا میرے ہاتھ میں۔ کبھی وہ پڑھتے تھے اور میں نسخے کو دیکھتا تھا، کبھی میں پڑھتا تھا اور وہ نسخے کو دیکھتے تھے۔ اس طرح ہم نے شروع کیا، یہاں تک کہ ہم ایک مصرع پر پہنچے، جو ناموزوں بھی تھا اور بے معنی بھی۔ ہم نے بہت کوشش کی لیکن مشکل حل نہ ہوئی۔ اسی وقت ایک بزرگ، جن کو ملک یار کہتے تھے، تشریف لے آئے۔ مولانا علاء الدین نے کہا کہ اس مصرع کی صحت ان سے دریافت کریں۔ مولانا ملک یار نے اس مصرع کو اس طرح موزوں اور بامعنی پڑھا کہ میرے دل کو اس کی صحت کا یقین ہو گیا۔ اس کے بعد مولانا اصولی نے مجھ سے کہا کہ مولانا ملک یار نے اس کے معنی کو از سر ذوق دریافت کیا ہے۔ شیخ کبیر نے فرمایا کہ اس روز تک میں ذوق کو صرف حسی ذوق سمجھتا تھا، اس دن مجھے معلوم ہوا کہ ذوقِ معنوی کیا ہے۔

اس کے بعد شیخ کبیر نے فرمایا کہ ملک یار زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن خدا تعالیٰ نے ان کو علم کرامت دیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ ملک یار کو جامع مسجد بداؤں کا امام مقرر کیا گیا۔ اس بات پر کہ وہ اس عہدے کے لائق ہیں یا نہیں، ہر شخص اپنی رائے دیتا تھا۔ جب یہ خبر مولانا علاء الدین اصولی کو پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ اگر ان کو جامع مسجد بغداد کا امام بنایا جائے تو وہ عہدہ بھی ان کی اہلیت کے مقابلے میں حقیر ہوگا۔ (۹ رشوال ۷۱۶ھ)۔

شیخ علاء الدین اصولی کے بارے میں شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی نے بھی ایک روایت بیان کی ہے "مولانا علاء الدین اصولی کسی سے کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے، لیکن اگر ضرورت کے وقت کوئی کچھ لے آتا تو اس کو بہ قدر حاجت قبول کر لیتے تھے۔ ایک دن بیٹھے کھلی (کنجازہ) کھا رہے تھے' چونکہ آپ کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ اتنے میں حجام آیا۔ آپ نے اس سے اپنے فقر کو چھپانے کے لیے کھلی کو اپنی دستار کے نیچے چھپا لیا۔ حجام نے پہلے آپ کی داڑھی تراشی' پھر آپ کا سر مونڈنے کے لیے آپ کی دستار اٹھائی تو کھلی زمین پر گر پڑی۔ حجام کو معلوم ہو گیا کہ مولانا کھلی کھا رہے تھے لیکن مجھے دیکھ کر شرم کی وجہ سے اس کو اپنی دستار میں چھپا لیا۔ حجام ایک مشہور اور بڈھا آدمی تھا اور اس کی بزرگوں تک رسائی تھی۔ مولانا اصولی سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایک دولت مند کے پاس گیا اور کہا کہ تمھاری دولت کس دن کام آئے گی جب کہ ایسا بزرگ فاقے کر رہا ہے۔ (پھر یہ واقعہ اس دولت مند سے بیان کیا)۔ اس دولت مند نے چند من آٹا، چند برتن گھی اور ایک ہزار جیتل مولانا کی خدمت میں بھیجے۔ مولانا نے یہ چیزیں قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان کو واپس کر دیا"۔ پھر مولانا نے حجام کو بلا کر تنبیہ کی حجام نے [illegible] ار کیا اور

اور معافی کا خواستگار ہوا۔ (خیر المجالس، مجلس پنجاہ و ششم، صفحہ ۱۹۰)

ہم کو شیخ کبیر کے بچپن کے حالات زیادہ تفصیل سے نہیں ملتے ہیں۔ لیکن آپ نے اثنائے گفتگو میں آٹھ یا نو بداؤں کے بزرگوں کا ذکر کیا ہے جس سے بداؤں کے مسلمانوں کی مذہبی فضا کا کچھ پتا چلتا ہے اور اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کا ان کی طبیعت پر کیا اثر پڑا تھا۔ اب پورے ترجمے کی بجائے فوائد الفواد کا خلاصہ اکثر جگہ کافی ہوگا۔

مولانا سراج الدین۔ آپ بداؤں سے مکہ معظمہ اس نیت سے گئے تھے کہ حج کرنے کے بعد وہیں رہیں گے اور اسی خاک پاک میں دفن ہوں گے لیکن حج کر کے بداؤں واپس آگئے اور وہیں رہنے لگے۔ جب وجہ دریافت کی گئی تو آپ نے جواب دیا: "ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ جنازوں کو اطراف سے لاتے ہیں اور مردوں کو ان جنازوں سے نکال کر حوالی مکہ میں دفن کرتے ہیں۔ اسی طرح بعضے مردوں کو، جو مکہ کے چاروں طرف دفن ہیں، اُن کو وہاں سے نکال کر باہر لے جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا حال ہے؟ جواب ملا کہ وہ گروہ جو اس موضع کی اہلیت رکھتے ہیں، ان کے بارے میں فرمان ہے کہ اگر کسی دُور جگہ دفن ہوں تو یہاں لائے جائیں۔ اسی طرح جو لوگ اس مقام کی اہلیت نہیں رکھتے، اُن کے بارے میں فرمان ہے کہ گو یہاں دفن کیے گئے ہیں، ان کو باہر لے جائیں۔ جب مجھے اس بات کی تصدیق ہوگئی تو میں بداؤں واپس آیا، اس لیے کہ اگر اُس مقام کے لائق ہوں گا تو میری آرزو پوری ہو جائے گی۔ (۲۳ رجب ۷۱۹ھ)"

خواجہ احمد۔ شیخ کبیر نظام الدین اولیاء کے دوست تھے۔ بہت صالح، عبادت گزار اور ابدال صفت۔ باوجودیکہ لکھے پڑھے نہ تھے۔ برابر

مسائل اور احکام شرعی دریافت کرنے میں مشغول رہتے تھے اور ہر شخص سے ان کے بارے میں استفسار کرتے تھے۔ جب شیخ نظام الدین اولیا اپنی والدہ کے ساتھ دہلی چلے گئے تو راستہ میں کہیں اُن سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے حضور کی والدہ کی بیماری کے بارے میں سنا تھا لیکن اُن کے انتقال سے ناواقف تھے۔ جب آپ نے ان کو اطلاع دی کہ خدا نے آپ کی والدہ کو اپنے جوارِ رحمت میں بلا لیا ہے تو وہ تھوڑی دیر تک بہت رنجیدہ رہے آنسو بہائے اور ان کی حالت متغیر ہوگئی۔ کچھ زمانے کے بعد خواجہ احمد دنیا سے رحلت کر گئے۔ ان کی موت کے بعد میں نے ان کو خواب میں دیکھا۔ شیخ کبیر فرماتے ہیں کہ اس خواب میں بھی وہ اپنی پرانی عادت کے مطابق مجھ سے شریعت کے مسائل اور احکام پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ باتیں جو آپ پوچھ رہے ہیں زندگی کے لیے کارآمد ہیں لیکن آپ اب مردہ ہیں۔ یہ سن کر انھوں نے کہا کہ کیا تم اولیا خدا کو مردہ سمجھتے ہو؟

(۵ ربیع محرم سنہ ۷۱۸ھ)

شاہی موی تاب اور ابوبکر موی تاب۔ بداؤں میں یہ دو بھائی تھے۔ شیخ نظام الدین اولیا صرف بڑے بھائی شاہی موی تاب کو جانتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ قاضی حمید الدین ناگوری آپ کو شاہی روشن ضمیر کہتے تھے۔ جب ان کو قاضی حمید الدین نے خرقہ دیا تو کسی کو شیخ محمود موئنہ دوز کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ میں نے شاہی کو خرقہ دیا ہے، کیا یہ بات آپ کو پسند ہے؟ شیخ محمود موئنہ دوز نے جواب دیا کہ جو کچھ آپ کرتے ہیں پسندیدہ اور درست ہوتا ہے۔

(۱۰ ذیقعد سنہ ۷۱۶ھ)

لہ شیخ جمال آپ کو رسن تاب کہتے ہیں۔ آپ کی دکان کے پاس ایک درزی کی دکان بھی۔

شیخ کبیر نے شاہی موی تاب کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شہر کے باہر تفریح کے لیے گئے تھے۔ یاروں نے کھیر پکائی لیکن جب وہ کھیر شیخ شاہی موی تاب کے سامنے آئی تو آپ نے کہا کہ اس میں خیانت ہوئی ہے۔ تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ دو یار جنھوں نے یہ کام اپنے ذمّہ لیا تھا وہ ذمہ دار ہیں۔ جب دودھ اُبل کر ہانڈی کے باہر گرنے لگا، تو انھوں نے اس دودھ کو جو ضائع ہوجاتا پی لیا تھا۔ شیخ نے کہا کہ تم کو یہ نہ کرنا چاہیے تھا۔ اس کی سزا میں ان دونوں یاروں کو دھوپ میں اس وقت تک کھڑا کیا جب تک کہ ان کے جسم سے اتنا پسینہ نہ نکل گیا جتنا دودھ انھوں نے پیا تھا۔ اس کے بعد شیخ شاہی موی تاب نے ایک حجام کو بلایا اور کہا کہ اتنا ہی خون میرے جسم سے نکال لو۔
(۱۲ ذی الحجہ ۷۱۲ھ)

اس درمیان میں خواجہ شاہی موی تاب کا بیان پھر شروع ہوگیا۔ شیخ کبیر نے فرمایا کہ بداؤں میں ان کو بہت عزت اور شہرت حاصل ہوئی۔ تمام خلقت ان سے رجوع کرتی تھی اور جہاں وہ جاتے تھے ایک بڑی جماعت ان کے ساتھ ہوجاتی تھی۔ یہ شاہی موی تاب سیاہ رنگ کے تھے۔ اُس زمانہ میں بداؤں میں ایک درویش تھا جسے مسعود نخاسی کہتے تھے۔ خواجہ شاہی کا شور و غوغا دیکھ کر اس نے کہا: 'اے سیاہ! تو نے حمام خوب گرم کیا ہے، ڈر ہے کہ اس میں جل جائے گا'۔ شیخ کبیر نے فرمایا کہ ایسا ہی ہوا۔ خواجہ شاہی نے جوانی میں انتقال کیا۔" (۱۰ ذیقعد ۷۱۶ھ)

اس کے بعد ذکر ان کے بھائی خواجہ ابوبکر موی تاب کا ہوا۔ مولانا سراج الدین حافظ بداؤنی، جو حضور کے مریدانِ خاص میں سے ہیں، انھوں نے بیان کیا کہ خواجہ ابوبکر ایک رات کو اُٹھے، دوسری بار وضو کیا پھر دو رکعتیں

کے بعد خدا کی رحمت میں داخل ہو گئے۔ شیخ کبیر نے فرمایا: کما تعیشون تموتون۔ (جیسی زندگی، ویسی موت)۔ (۱۰ ذیقعد ۷۱۶ھ)

شادی مقری۔ گفتگو برکت قرآن اور اس کے حفظ کے بارے میں ہوئی۔ حضور نے فرمایا کہ بداؤں میں ایک ہندی غلام شادی مقری نام کا تھا۔ وہ بڑی صلاحیت کا آدمی تھا اور صاحب کرامت۔ اس کو قرآن ساتوں قرأت میں یاد تھا۔ ایک اس کی کرامت یہ تھی کہ جو ایک پارہ قرآن کا اس کی خدمت میں پڑھ لیتا تھا خداے تعالیٰ اس کو تمام قرآن کے حفظ کرنے کی توفیق دیتا تھا۔ میں نے اس کے سامنے ایک سیپارہ قرآن کا پڑھا ہے اور اس کی برکت سے مجھے پورا قرآن حفظ ہو گیا ہے۔

علی مکی۔ کچھ بیان علی مکی کا ہوا۔ شیخ کبیر نے فرمایا کہ وہ ایک نیک اور بابرکت شخص تھے۔ آپ نے بارہا خدا سے التجا کی کہ مجھے موت ایسے وقت آئے جب میں نہ شہر (دہلی) میں ہوں، نہ اس جگہ جہاں میں پہنچنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یعنی موت مجھے راستے میں آئے جہاں کوئی مجھے جانتا پہچانتا نہ ہو۔ اس کے بعد حضور نے فرمایا کہ آپ بداؤں کی طرف روانہ ہوئے، راستے میں آپ بیمار پڑے، قصبۂ بجلانہ سے روانہ ہونے کے بعد آپ کی بیماری بڑھ گئی اور حالت خطرناک ہو گئی۔ قبل اس کے کہ آپ بداؤں پہنچیں آپ کا انتقال ہو گیا اور آپ کو وہیں راستے میں دفن کر دیا گیا۔ (۱۱ جمادی الاول ۷۱۶ھ)

عزیز بشیر۔ یہ بداؤں کے درویش تھے اور دہلی اس امید میں آئے کہ قاضی حمید الدین ناگوری کے فرزند مولانا ناصح الدین سے خرقہ حاصل کریں۔ اس معاملے کے لیے حوض سلطان کے کنارے ایک محفل طلب کی گئی۔ جو درویش جمع ہوئے تھے انھوں نے حوض سلطان کے پانی کی پاکی کی تعریف کی، لیکن عزیز بشیر

جن کو خرقہ ملنے والا تھا، بول اُٹھے: "یہ چھوٹا حوض ہے، حوضِ ساغر بداؤں اس سے کہیں بہتر ہے۔" یہ سن کر ایک بزرگ، محمد کبیر نے مولانا ناصح الدین سے کہا کہ "اس کو خرقہ نہ دیجیے، یہ ایک جھوٹا آدمی ہے۔" چنانچہ مولانا ناصح الدین نے عزیز بشیر کو خرقہ نہیں دیا۔ (۱۰ ذیقعدہ ۷۱۶ھ)

خواجہ عزیز کوتوال بداؤں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ درویشوں پر اعتقاد رکھتے تھے اور ان کا تعلق بداؤں کے شیخ ضیاء الدین سے تھا۔ کبھی کبھی درویشوں کو یاد کرتے، ان کو اپنے یہاں دعوت میں بلاتے[لف] اور مالی مدد کرتے تھے۔ جوانی میں بداؤں میں شہید ہوئے۔ ان کے بارے میں شیخ کبیر نے فرمایا: ایک دن میں بداؤں کے آموں کے باغ کی طرف گیا تھا جس کو لکھی الو کہتے تھے۔ عزیز کوتوال ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے اور اُن کے سامنے کھانے کا دسترخوان بچھا تھا۔ مجھے دور سے دیکھ کر پکارا اور کہا "مرحبا آؤ"، میں ڈر گیا کہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچائیں، لیکن جب میں قریب پہنچا تو انھوں نے مجھے تعظیم کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا۔ میں نے کھانا کھایا اور واپس آیا۔ (۱۰ ذیقعدہ ۷۱۶ھ)

بداؤں کے ایک صائم الدہر۔ شیخ کبیر اس مسئلہ پر بحث کر رہے تھے کہ کھانا دینے والے کو متقی ہونا چاہیے اور جس کو کھانا دے اس کو بھی متقی ہونا چاہیے لیکن دینے والا کس طرح جانے کہ جس کو وہ کھانا دیتا ہے، متقی ہے؟ بعد ازاں

لف یہاں فارسی متن میں کچھ غلطیاں ہیں۔ میرے پیش رو، مولانا غلام احمد بریان نے اس جملے کا یوں ترجمہ کیا ہے: "کبھی کبھی درویشوں کی دعوت بھی کرتے اور صوفیوں کے مکان پر جاتے ... دیر تک ان سے مکالمہ کرتے۔" (صفحہ ۱۷۸)

آپ نے فرمایا کہ میں نے مشارق میں ایک حدیث پائی ہے جس سے اُمید بڑھتی ہے۔ اس حدیث میں حکم دیا ہے کہ کھانا ہر شخص کے سامنے پیش کرو، چاہے تم اس سے واقف ہو یا نہ ہو۔ پھر آپ نے بداؤں کے ایک صائم الدہر کی حکایت بیان کی۔ شام کی نماز کے وقت وہ اپنی دہلیز کے دروازے پر آتے تھے اور ان کے غلام دہلیز کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر ہر آنے اور جانے والے کو افطار کے لیے اندر بُلا لاتے تھے۔ (۲۷ ذی الحجہ ۷۱۸ھ)

قاضی جمال ملتانی۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ رسول خدا بداؤں میں ایک جگہ وضو کر رہے ہیں۔ جب جاگے تو فوراً اس مقام پر گئے۔ زمین تر تھی آپ نے کہا کہ میرے مرنے کے بعد میری قبر یہیں کھودنا۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو آپ کو اُسی جگہ دفن کیا گیا۔ (۱۰ محرم ۷۱۹ھ)

دوسرا باب

زمانۂ تعلیم

اجداد بزرگ شیخ کبیر کے بخارا کے سادات میں سے تھے۔ آپ کے دادا کا نام خواجہ علی بخاری تھا۔ اور آپ کے نانا کا نام خواجہ عرب تھا۔ ان دونوں میں برادرانہ دوستی تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ بخارا سے لاہور آئے اور لاہور سے بداؤں۔ چونکہ اس زمانے میں بداؤں "قبۃ الاسلام" تھا۔ آپ دونوں نے یہیں سکونت اختیار کی۔ خواجہ عرب ایک خوشحال شخص تھے۔ آپ کے ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹے کا نام خواجہ عبداللہ تھا (اُن کے بیٹے خواجہ سعید، ان کے بیٹے خواجہ عبدالعزیز اور ان کے بیٹے خواجہ حسن۔ یہ خواجہ عرب کی اولادِ نرینہ کی چار پشتیں ہوئیں)۔ آپ کی بیٹی، بی بی زلیخا کا نکاح خواجہ علی کے بیٹے خواجہ احمد سے ہوا۔ بی بی زلیخا کو بزرگوں کی رسم کے مطابق ان کے والد نے کافی جہیز دیا۔ شیخ کبیر خواجہ احمد بن خواجہ علی اور بی بی زلیخا کے بیٹے ہیں۔ شیخ کبیر بہت چھوٹے تھے جب ان کے والد خواجہ احمد بیمار ہوئے۔ بی بی زلیخا نے خواب میں دیکھا کہ ان سے پوچھا جاتا ہے کہ دونوں (یعنی اپنے شوہر اور بیٹے) میں سے ایک کو چنیں۔ آپ نے اپنے بیٹے کو انتخاب کیا۔ جب دن ہوا تو آپ نے اپنا خواب کسی سے نہ کہا۔ لیکن خواجہ احمد کے

پرہیز پر اصرار کم کر دیا اور کھانے پینے کے لیے وہ جو کچھ بھی چاہتے تھے، ان کو دینے لگیں۔ تھوڑے زمانے کے بعد خواجہ احمد کا انتقال ہو گیا۔ ان کا روضۂ مبارک اس وقت تک بداؤں میں ہے[1]

جب شیخ کبیر کچھ بڑے ہو گئے تو آپ کی والدہ نے آپ کو مکتب بھیجا۔ آپ نے قرآن ختم کیا اور دوسری کتابیں پڑھنے لگے۔ شیخ نصیر الدین محمود فرماتے ہیں: "جب شیخ نے مولانا علاء الدین اصولی کی خدمت میں قدوری ختم کر لی تو مولانا اصولی نے فرمایا کہ مولانا نظام الدین اب تم کو دستار باندھنا چاہیے۔ شیخ اس وقت تک چہار گزی باندھتے تھے۔ دستار آپ کو میسر نہ تھی۔ آپ اپنی والدہ کی خدمت میں گئے اور کہا کہ مولانا نے فرمایا ہے کہ اب تم کو دستار باندھنا چاہیے، لیکن میں دستار کہاں سے حاصل کروں۔ ان کی والدہ نے جواب دیا 'بابا تم اطمینان رکھو، میں دستار کا انتظام کر دوں گی۔ فوراً روئی منگائی اور ایک

---

[1] سیر الاولیا، صفحہ ۹۴ الخ۔ بی بی زلیخا کے خواب کے بیان کی ذمہ داری کلیتہً مصنف سیر الاولیا پر ہے۔ یہ بیان بے لطف و تکلیف دہ اور بے سند ہے۔ کسی عورت سے یہ کہنا کہ اپنے شوہر اور بیٹے کی زندگی میں کسی ایک کو چنو، اس پر ظلم ہے۔ دوم اگر بی بی زلیخا نے اپنے خواب کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہا تو ایک صدی کے بعد امیر خورد کو اس کے بارے میں کس طرح سے علم ہوا۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر ان خاتون بزرگ سے یہ سوال کیا گیا ہوتا تو وہ اپنے بیٹے کے فلسفۂ زندگی کے مطابق جواب دیتیں کہ اس معاملہ کا تعلق مشیت ایزدی اور رموزِ غیبی سے ہے، میں خدا کے حکم پر راضی ہوں۔ سیر العارفین میں لکھا ہے کہ آپ کے والد کے انتقال کے وقت آپ کی عمر پانچ برس کی تھی۔

دُھنے کو دی کہ اس کو دُھن دے۔ آدھی دُھنی ہوئی روئی شیخ کی والدہ نے کاتی اور آدھی اپنی کنیز کو کاتنے کے لیے دی۔ پھر ایک جولاہے کو جو آپ کے جوار میں رہتا تھا، دھاگا بٹنے کے لیے دی اور فرمایا کہ یہ کام جلدی کر دو۔ جولاہے نے اور کام چھوڑ دیا اور اسی پر لگ گیا اور دو تین دن میں کپڑا بن کر شیخ کی والدہ کے پاس لایا۔ اس کپڑے پر کلف نہیں کیا تھا۔ صرف پانی میں دھویا تھا۔ شیخ نے کہا: میں نے کتاب ختم کی ہے، اگر کچھ کھانے کی چیز بھی ہو تو اس دستار اور کھانے کی چیز کو مولانا کی خدمت میں لے جاؤں۔ آپ کی والدہ نے چالیس کھانے کی چیزیں (خوردہ) حاصل کر کے آپ کو دیں۔ آپ ان کو مولانا کی خدمت میں لے گئے اور دستار کو مولانا کے سامنے رکھا۔ مولانا نے کچھ اپنے گھر سے اس میں بڑھایا اور دعوت تیار ہوگئی۔ مولانا نے کہا: علی مولا کو بلاؤ۔ اس وقت بداؤں میں دو علی مولا تھے علی مولا بزرگ اور علی مولا خرد۔ علی مولا بزرگ کو (جو شیخ جلال الدین تبریزی کے مرید تھے) طلب کیا گیا۔ آپ صاحب نفس تھے اور قبولِ عام رکھتے تھے۔ کھانا پیش کیا گیا۔ جب کھانا ختم ہوا، مولانا نے دستار کو اپنی طرف کھینچا اور پھیلایا۔ (ایک سرا) اپنے ہاتھ میں لیا اور شیخ سے کہا کہ دستار باندھو۔ شیخ جب گھومتے تھے تو اپنا سر استاد کے پیروں پر رکھ دیتے تھے۔ شیخ علی نے جب یہ دیکھا تو ہندی میں کہا: "ارے مولانا! یہ بڑا ہوسی" (یہ مرد بزرگ ہو جائے گا) مولانا نے دریافت کیا کہ آپ یہ کیسے کہتے ہیں۔ شیخ علی نے جواب دیا کہ "میں نے اس میں دو چیزیں دیکھی ہیں۔ اول جب اس کے سر پر دستار بندھتی ہے تو وہ کسی کے پیروں پر پڑتا ہے۔ دوسرے اس کی دستار ریشم کی نہیں ہے سادہ ہے[۵]"

---

۵ خیر المجالس۔ مجلس پنجاہ و ششم۔ صفحہ ۱۹۱۔

امیر خورد لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ بی بی زلیخا کی کنیز بھاگ گئی۔ اس کے علاوہ مکان میں کوئی کام کرنے کو نہ تھا۔ آپ نے خدا سے مناجات کی اور کہا کہ جب تک میری کنیز واپس نہ آئے گی، میں سر پر دوپٹہ نہ اوڑھوں گی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ کسی نے دروازے سے آواز دی کہ تمھاری کنیز بھاگ گئی تھی، اس کو لے جاؤ۔[1]

شیخ کبیر فرماتے ہیں کہ جب میں بارہ سال کا تھا، کم یا زیادہ، اور الفاظ کے لغوی معنی یاد کر رہا تھا، ایک شخص جس کو ابوبکر خراط اور ابوبکر قوال کہتے تھے، میرے اُستاد کی خدمت میں آیا۔ قوالِ مذکور ملتان کی طرف سے آیا تھا۔ اس نے کچھ عربی اشعار سنائے جو اس نے شیخ بہاء الدین زکریا کے سامنے پڑھے تھے۔ پھر شیخ موصوف کے مناقب بیان کرنے لگا کہ وہاں ذکر اور عبادت کی کثرت ہے۔ یہاں تک کہ لونڈیاں آٹا پیستے وقت بھی ذکر کرتی ہیں۔ ان باتوں کا میرے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔[2] پھر اس نے بیان کیا کہ میں اجودھن آیا اور ایسے بادشاہِ طریقت کو دیکھا۔ جب میں نے شیخ فرید الدین کے مناقب سُنے تو میرے دل میں یکی ارادت اور محبت پیدا ہوئی، یہاں تک کہ ہر نماز کے بعد میں دس بار شیخ فرید الدین اور دس بار مولانا فرید الدین کہنے لگا۔ یہ محبت اتنی پختہ ہوگئی کہ میرے سب دوستوں کو اس کی خبر ہوگئی۔ اگر وہ مجھ سے کوئی بات پوچھتے تھے اور چاہتے کہ میں قسم کھاؤں تو کہتے تھے کہ شیخ فرید کی قسم کھاؤ۔

---

[1] سیر الاولیا۔ باب اول۔ شیخ نظام الدین اولیا، نکتۂ چہار دہم۔

[2] باوجود اختلافِ اصول کے حضور نے ہمیشہ شیخ بہاء الدین زکریا کا ادب کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ سب سے بڑی تعریف ان کی آپ نے یہ کی ہے کہ "نفس گیرا" رکھتے تھے۔ "نفس گیرا" کے معنی پر آگے چل کر بحث ہوگی۔

اس کے بعد دہلی کی عزیمت ہوئی۔ ایک بزرگ عزیز، عوض نام میرے ساتھ تھے۔ اگر کہیں شیر یا ڈاکو کا خوف ہوتا تھا تو وہ کہتے تھے "اے پیر حاضر رہیے! اے پیر میں آپ کی پناہ میں ہوں"۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ پیر کس کو کہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ شیخ فریدالدین کو۔ اس کی وجہ سے ایک اور شوق اور ذوق میرے دل میں پیدا ہوگیا۔ اس سفر میں ایک اور صاحب مولانا حسین خندانی میرے ساتھ تھے۔ مردِ نیک تھے۔ جب دہلی پہنچا تو قسمت نے شیخ نجیب الدین متوکل (شیخ فرید کے چھوٹے بھائی) کے پڑوس میں اتارا۔ مقصودِ حکایت یہ ہے کہ جب خدا کسی پر بخشش کرتا ہے تو اس کے اسباب بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ (۲۷ ذیقعد ۷۱۵ھ)

دہلی میں تین یا چار سال تک شیخ کبیر نے تحصیل علم میں بہت کوشش کی۔ آپ نے طالب علموں کی گفتگو میں اپنا سکہ جمالیا۔ بقول امیر خورد آپ کو 'بحّاث' اور 'محفل شکن' کا خطاب دیا گیا۔ آپ نے اس زمانے کے تمام علوم مختلف اساتذہ سے پڑھے۔ لیکن امیر خورد صرف دو بزرگوں کا نام لیتے ہیں۔ اوّل اس زمانے کے سب علماء کے استاد خواجہ شمس الدین خوارزمی سمجھے جاتے تھے۔ آپ نے ان سے چہل مقام حریری پڑھے۔ فوائد الفواد میں ان کے بارے میں لکھا ہے: بعد ازاں آپ نے فرمایا کہ خواجہ شمس الملک کی عادت تھی کہ اگر شاگرد سبق ناغہ کرتا یا کوئی دوست بہت دیر کے بعد آتا تو فرماتے کہ میں نے کیا کیا ہے جس کی وجہ سے تم نہیں آئے۔ اگر آپ کسی سے مذاق کرنا چاہتے تو مسکرا کر کہتے (کہ بتاؤ) کہ میں نے کیا کیا ہے کہ تم نہیں آئے تاکہ پھر وہی کروں۔ پھر فرمایا کہ اگر میں ناغہ کرتا یا دیر کے بعد جاتا تو مجھے خیال ہوتا کہ مجھ سے بھی ایسی کوئی بات کہیں گے۔ لیکن

لہ سیر الاولیاء کے مطابق آپ کی عمر دہلی کے سفر کے وقت سولہ برس کی تھی، لیکن سیر العارفین میں لکھا ہے کہ آپ پچیس برس کے تھے۔

مجھ سے وہ یہ کہتے :

آخر کم ازان کہ گاہ گاہی

آیی و بما کنی نگاہی

یہ بیت پڑھتے وقت شیخ کبیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور تمام حاضرینِ محفل میں رقت پیدا ہو گئی۔ حاضرین میں سے ایک نے پوچھا کہ میں نے سُنا ہے کہ جب آپ خواجہ شمس الملک کی خدمت میں جاتے تھے تو وہ آپ کی بہت عزت کرتے تھے اور آپ کو اس کمرے (چھجہ) میں بٹھاتے تھے جو ان کا مخصوص مقام تھا۔ حضور نے جواب دیا کہ ہاں، ان کے خاص کمرے میں کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی بجز میرے، قاضی فخر الدین ناقلہ اور مولانا برہان الدین باقی کے۔ میں کہتا کہ یہ آپ کی جگہ ہے۔ لیکن وہ کہتے کہ بیٹھو! میری معذرت نہ قبول کرتے اور مجھے وہیں بٹھاتے۔ حاضرین میں سے ایک نے پوچھا کہ ان کو کسی وقت حکومت کا عہدہ ملا ہے؟ حضور نے فرمایا، ہاں مستوفی مقرر ہوئے تھے۔ خواجہ تاج الدین ریزہ نے ان کے بارے میں یہ بیت کہی ہے :

صدرا، کنون بہ کام دلِ دوستاں شدی

مستوفیٔ ممالک ہندوستاں شدی

بندے نے عرض کیا کہ خواجہ شمس الملک کی بزرگی اور ان کے وفورِ علم کو ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن کوئی نہیں جانتا کہ آیا ان کو درویشوں سے محبت اور تعلق تھا۔ حضور نے فرمایا کہ اچھا عقیدہ رکھتے تھے۔ میری تعظیم کرنا اُن کی خوبی اعتقاد کی دلیل ہے[۱]۔ (۳ ربیع الاول ۷۱۱ھ)

---

[۱] آپ کا نام شمس الدین تھا۔ شمس الملک کا خطاب آپ کو سلطان غیاث الدین بلبن سے ملا تھا۔

آپ کے دوسرے اُستاد، جن کا امیر خورد نے ذکر کیا ہے شمس الملک سے بالکل مختلف تھے۔ آپ نے مشارق الانوار مولانا کمال الدین زاہد سے پڑھی۔ اجازت نامہ کے عربی الفاظ جو مولانا زاہد نے اپنے ہاتھ سے لکھے، امیر خورد نے شیخ کبیر کے نسخہ مشارق سے نقل کیے ہیں۔ اس اجازت نامہ میں مولانا زاہد لکھتے ہیں کہ انھوں نے شیخ کبیر کو مشارق اس مسجد میں پڑھائی جو نجم الدین ابی بکر الطوسی سے منسوب ہے۔ مولانا زاہد نے دو استادوں کا نام لیا ہے، محمود ابی الحسن و سعد بلخی، جن سے انھوں نے مشارق کا درس لیا تھا اور جنھوں نے مشارق خود اس کے مصنف مولانا رضی الدین صغانی سے پڑھی تھی۔ اجازت نامہ کی تاریخ ۲۲ ربیع الاوّل ۶۷۹ھ (۲۳ جولائی ۱۲۸۰ء) ہے۔ مولانا کمال الدین زاہد کی خودداری قابلِ تحسین تھی۔ سلطان غیاث الدین بلبن ایک ظالم بادشاہ تھا جس کی زندگی میں کثرتِ عبادت کے ساتھ کثرتِ جرائم بھی پائی جاتی تھی۔ اس نے اپنے سب حریفوں کو موت کے گھاٹ اتار کر ایک جابرانہ حکومت قائم کی تھی۔ اُس کے دربار میں ہر شخص اس سے کانپتا تھا۔ بہر حال بلبن کو اپنے لیے ایک پیش نماز کی ضرورت ہوئی۔ اس نے مولانا کمال الدین زاہد کو اپنے دربار میں بلایا اور کہا کہ اگر آپ اس عہدے کو قبول کرلیں تو مجھے یقین ہو جائے گا کہ میری نماز خدا کے یہاں مقبول ہے۔ مولانا کا جواب سنہرے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے: "ہمارے پاس ہماری نماز کے علاوہ اور کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ اب کیا بادشاہ چاہتا ہے کہ اس کو بھی ہم سے لے لے۔" بلبن ساکت ہو گیا اور معذرت کے بعد آپ کو دربار سے واپس کر دیا۔

سیر العارفین نے ضمناً شیخ کبیر کے ایک استادِ حدیث مولانا امین الدین تبریزی کا بھی ذکر کیا ہے۔[۱] علاوہ بریں حضور نے ایک اُستاد دہلی، مولانا برہان نسفی

---

[۱] صفحہ ۲۶

کا ذکر کیا ہے جو اپنے شاگردوں سے تین وعدے لیتے تھے۔ اول یہ کہ دن رات میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھائے۔ دوسرے یہ کہ کوئی سبق ناغہ نہ کرے، تیسرے یہ کہ اگر مولانا سے راستے میں ملے تو صرف سلام کرے اور اپنا راستہ لے۔ ان کے پیروں پر نہ پڑے اور راستے میں زیادہ تعظیم نہ کرے[1] لیکن آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ ان کے شاگرد تھے۔

امیر خورد کہتے ہیں کہ جب شیخ کبیر بداؤں سے دہلی آئے تو انھوں نے اپنی ماں اور بہن کو بازار کے درمیان ایک سرائے میں، جس کو سرائے نمک کہتے تھے، اُتارا اور خود ایک تیر بنانے والے کے کمرے (بارگاہ) میں رہنے لگے۔ آپ کے پاس 'فتوح' کے علاوہ کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ 'فتوح' کے معنی ہیں وہ چیز جو کوئی شخص بغیر مانگے ہوئے دے جائے۔ یہ بھی شرط تھی کہ درویش کے دل میں یہ خیال نہ گزرے کہ مجھے فلاں چیز کی فلاں شخص سے اُمید ہو سکتی ہے۔

فوائد الفواد میں ہے: "اسی حال میں حضور نے فرمایا کہ شروع زمانہ سے میرے دل میں خواہش چیزیں جمع کرنے کی نہ تھی، میں ہرگز طلبگار دنیا نہ تھا۔ پھر شیخ الاسلام شیخ فرید سے تعلق ہوا، جن کا مسلک ترک کلی تھا اور جو دونوں عالموں میں سے کسی پر نظر نہ ڈالتے تھے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اس سے پہلے مجھ پر معاش کی تنگی تھی اور وقت خوشی سے گزرتا تھا۔ ایک دن کوئی میرے پاس آدھا تنکہ بے وقت لایا۔ میں نے خیال کیا کہ آج بے وقت ہے، جو حاجت تھی پوری ہو گئی، اس کو صبح کو خرچ کروں گا۔ جب رات آئی اور میں عبادت میں مشغول ہوا، تو اس آدھے تنکہ نے میرے دامن کو پکڑا اور مجھے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ یہ دیکھ کر میں نے کہا کہ اے خداوند! کب صبح ہو گی کہ میں اس آدھے تنکہ کو خرچ

---

[1] فوائد الفواد۔ ۱۱ رجمادی الاول ۷۱۶ھ

کر سکوں گا۔ (۲۵ محرم ۷۱۱ھ)۔

امیر خوردؒ[1] نے آپ کی طالب علمانہ زندگی کے افلاس اور تنگی کا حال یوں بیان کیا ہے:" حضور فرماتے تھے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں دو جیتل کا ایک من خربوزہ ملتا تھا۔ لیکن فصل کا زیادہ حصہ گذر گیا اور میں نے خربوزہ نہ چکھا۔ میں اس سے خوش تھا اور میری خواہش تھی کہ بہتر ہوگا اگر باقی فصل بھی میں خربوزہ نہ کھاؤں۔ آخر فصل میں ایک آدمی میرے پاس چند خربوزے اور چند روٹیاں لایا۔ چونکہ وہ غیب سے آیا تھا میں نے اس دن فصل کا خربوزہ کھایا۔ (ایک اور دفعہ کا واقعہ) آپ نے بیان کیا کہ ایک رات اور ایک دن اور دوسری رات کا آدھا حصہ گذر گیا کہ میرے پاس کچھ کھانے کو نہ تھا۔ اس زمانے میں ایک جیتل کی دو سیر میدے کی روٹی بکتی تھی، لیکن میرے پاس ایک جیتل بھی نہ تھا کہ میں روٹی کھا سکوں۔ میری والدہ بوا ہن اور دوسرے لوگوں کا بھی، جو میری کفالت میں تھے، یہی حال تھا۔ اگر ایسی حالت میں کوئی ہمارے پاس ترکاری، شکر یا قیمتی کپڑا لاتا، تو اگرچہ اس کو بیچ کر ہم غذا فراہم کر سکتے تھے لیکن ہم ایسا نہ کرتے تھے کیونکہ ہم سمجھتے تھے کہ وہ غیب سے آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح بھوک سے نجات نہ ملتی۔ شیخ نصیر الدین محمود کہتے ہیں کہ میں نے شیخ کبیر سے سنا ہے کہ اس زمانے میں جب میں اس برج میں رہتا تھا جو دروازۂ منڈہ کے قریب ہے، میرے اوپر تین رات اور دن ایسے گذرے کہ میں نے کچھ نہ کھایا۔ پھر ایک شخص آیا اور اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے کسی سے کہا کہ دیکھو دروازے پر کون ہے۔ وہ گیا اور اس نے دروازہ کھولا۔ ایک شخص نے اس کو کھچڑی سے بھرا ہوا پیالہ دیا اور چلا گیا۔ میں نے پوچھا کہ

---

[1] باب اول، شیخ نظام الدین اولیاء، نکتہ ہفتم۔

تم اُس شخص کو جانتے ہو؟ اس نے کہا نہیں۔ میں نے اس کھچڑی کو کھایا اور جو ذوق اور حلاوت مجھے اُس کھچڑی میں ملی، میں نے اب تک کسی کھانے میں نہیں پائی۔ ہر نعمت جو اس ضعیف کو اب تک ملی ہے کسی آنے والے کے طفیل میں ملی ہے۔ حضور نے یہ بھی فرمایا کہ میری والدہ کی عادت تھی کہ جب گھر میں غلہ نہ رہتا تھا تو کہتی تھیں کہ آج ہم خدا کے مہمان ہیں۔ مجھے یہ سُن کر ایک ذوق اور راحت حاصل ہوتی تھی جس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ اتفاق سے ایک شخص ایک من غلہ میرے گھر میں دے گیا جس سے چند دن متواتر روٹیاں پکیں۔ میں تنگ آگیا کہ میری والدہ مجھ سے پھر کب کہیں گی کہ ہم خدا کے مہمان ہیں۔

آپ کی والدہ کا انتقال آپ کی طالب علمی کے زمانے میں ہوا۔ مخدومہ کچھ عرصے تک بیمار رہیں اور آپ کو مختلف قبروں کی زیارت کے لیے بھیجا گیا۔ پہلی جمادی الآخر کو حالت خراب ہونے لگی اور آپ نے شیخ کبیر سے کہا کہ آج تم شیخ نجیب الدین متوکل کے گھر میں جاکر سو رہو۔ صبح کے قریب ایک کنیز آئی کہ آپ کی والدہ آپ کو بلا رہی ہیں۔ بی بی زلیخا نے آپ کا داہنا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ خداوندا! میں اس کو تیرے سپرد کرتی ہوں۔ یہ کہہ کر جاں بحق تسلیم کی۔[1]

دہلی میں بہت دولت مند ترکی امرا تھے؛ لیکن ان میں سے کسی نے شیخ کبیر کا ہاتھ آپ کی طالب علمی کے زمانے میں نہیں پکڑا اور نہ آپ کسی دولت مند کے دروازے پر حاضر ہوئے۔ آپ کے سب مددگار مزدور پیشہ تھے۔

اب ضروری ہے کہ چند بزرگوں کا بیان کیا جائے جن کا آپ کی تعلیمی زندگی پر اثر پڑا تھا۔

---

[1] سیر الاولیاء۔ باب اول۔ شیخ نظام الدین اولیاء۔ نکتۂ چہاردہم۔ یہ واقعہ امیر خورد نے اپنی بی بی کی سند پر بیان کیا ہے۔ سال وفات نہیں دیا ہے۔

شیخ نجیب الدین متوکل۔ شیخ نصیر الدین محمود فرماتے ہیں کہ آپ کا گھر بہت مختصر تھا۔ ایک حجرہ اور اس کے اوپر چھپر۔ آپ کی بی بی حجرے میں رہتی تھیں اور آپ حجرے کی چھت پر ایک چھپر کے نیچے۔ ایک عید کا واقعہ ہے کہ باہر سے کچھ مسافر پہنچے جو شیخ نجیب الدین کی حالت سے ناواقف تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک بزرگ ہیں جن کے چاروں طرف ہجوم ہے اور ہر شخص ان کے ہاتھ اور پاؤں چوم رہا ہے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے طے کیا کہ آج کا کھانا انھیں کے دسترخوان پر کھائیں۔ شیخ نجیب الدین کے گھر میں عید کے دن فاقہ تھا۔ جب درویش پہنچے تو آپ نے خیال کیا کہ اپنی بی بی کی چادر بیچ کر کچھ منگائیں۔ لیکن چادر میں اتنے پیوند تھے کہ اس کو کوئی نہ خریدتا۔ پھر آپ نے اپنا مصلیٰ بیچنے کا خیال کیا لیکن اس کی حالت بھی چنداں اچھی نہ تھی۔ مجبوراً آپ نے درویشوں کی رسم کے مطابق ایک کوزہ پانی کا ہاتھ میں لیا اور درویشوں کی مجلس کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ آنے والے درویش سب صاحبِ حال تھے۔ وہ کھڑے ہو گئے اور پانی پی کر چلے گئے۔[1]

فوائد الفواد میں شیخ نجیب الدین متوکل کا اکثر ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں صرف چیدہ چیدہ واقعات کا ذکر ہو سکتا ہے۔

جب آپ کو مدرس کے پاس بھیجا گیا تو مدرس نے پوچھا کہ کیا تم نجیب الدین متوکل ہو؟ آپ نے جواب دیا کہ میں متأکل[2] ہوں، متوکل کون ہو سکتا ہے! پھر مدرس نے پوچھا کہ کیا تم شیخ الاسلام شیخ فرید الدین کے بھائی ہو؟ آپ نے جواب دیا کہ برادرِ صوری میں ہوں، برادرِ معنوی کون ہو سکتا ہے۔ (۷ محرم ۷۰۸ھ)

---

[1] خیر المجالس، مجلس بست و یکم، صفحہ ۷۵
[2] یعنی توکّل کو ڈھونڈ ھنے والا۔

حضور فرماتے ہیں: "ایک دن ان کی خدمت میں بیٹھا تھا۔ اس زمانے میں مَیں نے سر کے بال نہیں منڈائے تھے۔ میں نے درخواست کی کہ آپ ایک بار سورۂ فاتحہ اس نیت سے پڑھیے کہ میں قاضی ہو جاؤں۔ آپ خاموش رہے۔ میں نے یہ خیال کر کے کہ آپ نے سنا نہیں ہے، اپنی درخواست دُہرائی۔ جب آپ نے پھر بھی جواب نہ دیا۔ میں نے تیسری دفعہ درخواست کی۔ اس پر آپ نے ہنس کر کہا: 'تم قاضی مت ہو، کچھ اور ہو۔' الغرض آپ کو اس کام سے اس قدر نفرت تھی کہ آپ نے فاتحہ پڑھنے سے بھی انکار کیا۔" (۲ ر رمضان ۷۰۸ھ)

"دہلی میں ایتمر نام ایک ترک تھا۔ اس نے ایک مسجد بنائی اور شیخ نجیب الدین متوکل کو مسجد کا پیش نماز مقرر کیا۔ اور آپ کے لیے ایک گھر بھی تیار کرایا۔ اس ترک نے اپنی بیٹی کی شادی میں ایک لاکھ جیتل بلکہ اس سے بھی زیادہ خرچ کیا تھا۔ شیخ نجیب الدین نے ایک وقت اثنائے گفتگو میں ایتمر سے کہا: پکا مسلمان وہ ہے جس کی خدا سے دوستی اپنی اولاد کی دوستی پر غالب ہو۔ آپ نے ایک لاکھ جیتل سے زیادہ اپنی بیٹی کے اوپر خرچ کیا ہے۔ اب آپ اگر اس کی دوگنی رقم راہِ خدا میں خرچ کریں گے تو آپ پکے مسلمان ہوں گے۔ ایتمر اس کلام سے رنجیدہ ہوا اور امامت اور مکان شیخ نجیب الدین سے چھین لیا۔ آپ اجودھن شیخ فرید کی خدمت میں پہنچے اور یہ واقعہ بیان کیا۔ شیخ فرید نے فرمایا کہ خدا نے قرآن میں وعدہ کیا ہے:

ماننسخ من آیۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا۔

(جب ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو ویسی ہی آیت یا اس سے اچھی بھیجتے ہیں۔)
پھر شیخ فرید نے فرمایا کہ اگر ایتمر گیا ہے تو ایتکر آئے گا۔ اسی زمانے میں ایک بڑا ملک ایتکر نام اس دیار میں آیا اور شیخ فرید اور ان کے خاندان کی اتنی خدمت

کی کہ اس خدمت کی وجہ سے اس خاندان سے منسوب ہو گیا۔ (۲۱ رشوال ۷۱۱ھ)

اس کے بعد حضور نے فرمایا کہ میں نے شیخ نجیب الدین متوکل کے برابر اس شہر میں کسی کو نہیں دیکھا۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کون دن ہے اور کون سا مہینہ ہے یا غلہ کس نرخ سے ملتا ہے اور گوشت کس حساب سے بکتا ہے۔ آپ کا شغل اس پایہ کا تھا کہ ایسی چیزوں کی آپ کو خبر نہ ہوتی تھی۔ (۲۱ رجب ۷۱۳ھ)

حضور نے فرمایا کہ اُس زمانے میں اندرپت میں ایک عورت بنام بی بی فاطمہ سام تھیں۔ معمر، بزرگ اور بڑی صلاحیت والی۔ میں نے اُن کو دیکھا ہے، قابلِ عزت خاتون تھیں۔ اُن کو بہت شعر یاد تھے جو موقع کے مطابق پڑھتی تھیں۔ مجھے ان کے یہ دو مصرع یاد ہیں ؎

ہم عشق طلب کنی وہم جان خواہی

ہر دو طلبی وِلے میسّر نشود

پھر آپ نے فرمایا کہ شیخ نجیب الدین متوکل اور بی بی فاطمہ سام کے درمیان بھائی بہن کی محبت تھی۔ اکثر راتیں ایسی گذری ہیں کہ جب شیخ نجیب الدین اور ان کے خاندان کو فاقہ کرنا پڑا ہے[1] دوسری صبح کو بی بی فاطمہ سام ایک من یا آدھ من روٹی جلدی سے کسی کے ہاتھ بھیجتیں کہ ان کے گھر میں فاقہ ہوا ہے۔ ایک دفعہ جب یہ روٹیاں آئیں تو شیخ نجیب الدین نے مزاح کے طور پر کہا۔ "اے خدا! تو نے اس عورت کو میرے حال سے آگاہ کیا۔ اگر بادشاہِ شہر کو بھی آگاہ کر دیتا تو وہ مجھے کوئی چیز بابرکت بھیجتا۔" پھر آپ نے مسکرا کر کہا کہ بادشاہوں میں وہ دل کی صفائی کہاں ہے کہ آگاہ ہوں۔" شیخ کبیر یہ بھی فرماتے ہیں کہ بی بی فاطمہ سام نے ان سے ایک بار کہا کہ فلاں شخص کی لڑکی بہت مناسب ہے، اگر تم نکاح کرنا

---

[1] آپ کے محمد اور احمد نام دو بیٹے تھے۔

چاہو۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب شیخ کبیر کلیتہً شیخ فرید کے اثر میں آچکے تھے۔ جب بی بی فاطمہ کو آپ کی روحانی حالت کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے کہا کہ میں نے صرف اس لڑکی کے باپ کے کہنے سے یہ بات کہی تھی۔ (۱۱ ذالحجہ ۷۲۰ھ)

قاضی منہاج السراج جوزجانی۔ آپ کی تاریخ 'طبقات ناصری' کافی مشہور ہے۔ کلکتہ اور کابل میں چھپ چکی ہے۔ آپ کے دادا ترکستان سے غزنی آئے۔ بادشاہِ غزنی سلطان ابراہیم کے چالیس بیٹیاں تھیں۔ ان کے لیے شہزادے ڈھونڈھنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے سلطان ابراہیم نے طے کیا کہ ان کا نکاح اچھا جہیز دے کر علماء کے ساتھ کر دیا جائے۔ ایک شہزادی کا نکاح مولانا کے دادا کے ساتھ ہوا۔ لیکن تحفظ کے خیال سے آپ کے خاندان نے طے کیا کہ فتح مند گروہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس لیے جب غزنی اور غور کے جھگڑے میں غوریوں کی طاقت زیادہ معلوم ہوئی، مولانا کے باپ نے غزنی کو چھوڑ کر غور کی خدمت اختیار کرلی۔ جب چنگیزی مغلوں[1] نے افغانستان پر حملہ کیا تو مولانا منہاج السراج کی عمر غالباً اٹھارہ برس کی تھی۔ آپ ہمت کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے اور آپ ان چند لوگوں میں سے تھے جن کو جامِ شہادت پینا نہیں پڑا۔ ہندوستان پہنچنے کے بعد آپ نے قباچہ کی نوکری کی۔ لیکن ظاہر تھا کہ قباچہ سلطان شمس الدین التمش کے مقابلے میں کامیاب نہ ہوسکے گا۔ اس لیے آپ نے قباچہ کی ملازمت چھوڑ کر سلطان التمش کی نوکری اختیار کی۔ التمش خود اپنے آقا قطب الدین ایبک کی طرح ایک زرخریدہ

---

[1] انگریزی میں ان کو منگول کہتے ہیں۔ میرے ایک چینی طالب علم نے مجھ سے کہا کہ لفظ 'مانگو' کے معنی چینی میں بہادر کے ہوتے ہیں، اور لفظ 'منگول' اسی سے نکلا ہے۔ اس زمانے کی فارسی کتابوں میں ان کو 'مغول' لکھتے ہیں۔

ترکی غلام تھا جس کو اس کے آقا نے ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم دی تھی۔ ایلتمش سلطنت دہلی کا اصلی بانی ہے۔ اس نے یہ اصول رکھا تھا کہ نیچے کے کام ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو دیئے جائیں، لیکن اعلیٰ عہدے یعنی مقطع یا گورنری، مرکزی وزارتیں اور تمام مرکزی حکومت کے شعبوں کی صدارت صرف غیر ہندوستانی مسلمانوں کو دی جائیں۔ ان غیر ہندوستانی مسلمانوں کے دو گروہ یا طبقے ہو گئے۔ ایک وہ زر خریدہ ترکی غلام جن کو معزالدین غوری، قطب الدین ایبک یا خود شمس الدین ایلتمش نے خریدا تھا اور اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا تھا۔ یہ ترکی غلام صاحب سیف و قلم تھے۔ جن کو ان کے آقاؤں نے اچھی طرح سے تعلیم دی تھی۔ ایک اوسط ترکی غلام کی قیمت پچیس ہزار تنکہ کے قریب ہوتی تھی۔ جب چنگیزی منگولوں نے عجم فتح کر لیا تو یہ ترکی غلاموں کی تجارت بھی ختم ہو گئی۔ دوسرا گروہ شریف اور احرار عجمیوں کا تھا جن کے خاندان حکومت کے رموز سے واقف تھے اور جن میں سے زیادہ ایسے تھے جنھوں نے چنگیزی حملوں کی وجہ سے ہندوستان میں پناہ لی تھی۔ جب تک سلطان ایلتمش زندہ رہا، اس نے حکومت میں ان دونوں طبقوں میں توازن رکھا۔ لیکن ایلتمش کے بیٹے اس کے بوجھ کو نہیں سنبھال سکے، اور ترکی غلاموں نے عجمی احراری افسروں پر قاتلانہ حملے شروع کر دیئے۔ بالآخر الغ خان[1] نے اس طبقے کے سب سے بڑے افسر قطب الدین غوری کو جو شہاب الدین غوری کا شرعی وارث ہوتا تھا، عام دربار میں قتل کروا دیا۔

مولانا منہاج السراج تین دفعہ قاضی القضات اور صدر الصدور کے

---

[1] الغ خاں نے ۱۲۶۶ء میں سلطان ناصر الدین محمود کو زہر دیا اور ان کے انتقال کے بعد تخت پر سلطان غیاث الدین بلبن کے لقب سے بیٹھا۔

عہدوں پر مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنی تاریخ بڑی احتیاط سے لکھی ہے۔ التتمش کے انتقال کے دس برس بعد تک کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ حکومت کیا رُخ لے گی۔ نہ بادشاہ کے تخت کو استحکام تھا اور نہ کسی ترکی غلاموں کے گروہ میں۔ ایک ہندوستانی افسر ریحان نے بادشاہ کو خوش کر کے امیر حاجب کا اعلیٰ عہدہ حاصل کیا لیکن ترکی غلاموں نے جن کو اکثر 'ترکان چہلگانی' کہا جاتا ہے، اس کو مل کر کے قتل کر دیا۔ چونکہ بیچارے ریحان کی کوئی پارٹی یا گروہ نہیں تھا، اس لیے مولانا منہاج السراج نے بلا خوف وخطر اس کو بہت بُرا بھلا کہا ہے۔ ریحان کا سب سے بڑا گناہ یہ تھا کہ وہ ترکی النسل نہیں تھا بلکہ قبائل ہندوستان میں سے تھا۔ لیکن جہاں تک ترکی غلاموں کا سوال تھا قاضی موصوف نے کوشش کی کہ ہر ترکی غلام اور ہر ترکی غلاموں کے گروہ یا پارٹی کو خوش رکھیں۔ یہی اصول آپ نے اپنی تاریخ میں رکھا ہے۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، التتمش کے انتقال کے بعد دس سال ایسے گذرے ہیں کہ ان میں یہ کہنا مشکل تھا کہ حکومت کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں آئے گی۔ قاضی موصوف نے دو بار اپنے حساب میں غلطی کی۔ اور اس کی وجہ سے موقوف ہوئے۔ ایک دفعہ موقوف ہونے کے بعد آپ کو دہلی سے لکھنوتی جانا پڑا۔ لیکن جب ۱۲۴۶ء میں الغ خاں بلبن نے التتمش کے بیٹے سلطان ناصر الدین کو تخت پر بٹھایا تب ظاہر ہو گیا کہ ناصر الدین برائے نام بادشاہ رہے گا اور حکومت الغ خاں بلبن کی ہو گی۔ اس کے بعد قاضی منہاج نے دونوں کی تعریف کرنا شروع کر دی، ایک کو بہ حیثیت سلطان اور دوسرے کو بہ حیثیت بادشاہ کے۔ مولانا نے اپنی تاریخ ۱۲۶۰ء میں ختم کر دی۔ اس کے بعد زندہ رہے لیکن 'طبقات ناصری' میں کچھ نہیں بڑھایا۔

جہاں تک عہدوں، آمدنی اور ترقی کا سوال ہے قاضی منہاج السراج

سلطنت دہلی کے سب علماء ظاہری سے فوقیت لے گئے۔ لیکن شیخ کبیر کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی تھا جو 'طبقات ناصری' میں نہیں ظاہر ہوتا۔ اُس وقت طلبہ کے لیے کھیل کود کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ایک مفلس طالب علم کے لیے دو ہی تفریح کے مواقع تھے۔ ایک آپس میں علمی مباحثے۔ حضور ان مباحثوں میں شریک ہوتے لیکن امیر خورد لکھتے ہیں کہ آپ کہا کرتے تھے کہ میں تمہارے حلقوں میں زیادہ نہیں رہوں گا۔ دوسرے مساجد میں تذکیر۔

کچھ تذکرہ قاضی منہاج الدین کا ہوا۔ حضور نے فرمایا کہ ہر دو شنبے کو میں ان کی تذکیر میں جایا کرتا تھا۔ ایک دن میں ان کی تذکیر میں موجود تھا جب انھوں نے یہ رباعی پڑھی۔

لب بر لبِ دلبران مہوش کردن
وآہنگ سر زلف مشوش کردن
امروز خوش است لیک فردا خوش نیست
خود را چو خسی طعمۂ آتش کردن

حضور نے فرمایا کہ جب میں نے یہ رباعی سنی تو بیخود ہو گیا اور کچھ دیر کے بعد میرے ہوش واپس آئے۔ پھر آپ نے ان کا حال بیان کیا کہ مرد صاحب ذوق تھے۔ ایک دفعہ ان کو شیخ بدرالدین غزنوی نے طلب کیا۔ وہ دو شنبہ کا دن تھا۔ آپ نے فرمایا کہ تذکیر سے فارغ ہونے کے بعد آؤں گا۔ تذکیر کے بعد مجلس سماع میں حاضر ہوئے۔ (سماع کے جذبے میں) آپ نے اپنی دستار اور جبہ کو پارہ پارہ کر ڈالا۔ پھر آپ نے شیخ بدرالدین کی وہ نظم جو آپ نے 'آتش گرفت' کی ردیف پر کہی ہے، گوائی۔ حضور نے ایک یا دو بیت پڑھیں۔

ایک بیت مجھے یاد ہے:

نوحۂ میکرد برمن نوحہ گر در مجمعی

آہ ازیں سوزم برآمد نوحہ گر آتش گرفت

پھر آپ نے فرمایا کہ قاضی منہاج الدین شیخ بدرالدین کو "شیر سُرخ" کہتے تھے۔ (۱۰ ربیع الاول ۷۱۰ھ)

" اس کے بعد حدیثوں کا ذکر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک دفعہ قاضی منہاج الدین نے اثنائے تذکیر میں کہا کہ چھ متواتر حدیثیں ہیں اور ان میں سے تین حدیثیں قاضی منہاج نے بیان کیں۔ پھر حضور مسکرائے اور کہا کہ یہ تین حدیثیں پڑھنے کے بعد قاضی منہاج نے کہا کہ باقی تین حدیثیں میں نہیں جانتا ہوں، اور اگر کوئی مجھے طعنہ دے اور کہے کہ کیوں نہیں جانتے ہو، تو میں کہوں گا کہ یہ تین حدیثیں تم نے مجھ سے سیکھی ہیں، تم بھی نہیں جانتے ہو۔ (۷ رجمادی الاول ۷۲۰ھ)

حکایت قاضی منہاج السراج اور ان کے تذکیر کے ذوق کی ہونے لگی۔ حضور نے فرمایا کہ بغیر ناغہ ہر دوشنبہ کو ان کی تذکیر میں جاتا تھا۔ کیا راحت ہوتی تھی ان کے بیان اور قاریوں کے پڑھنے سے۔ آپ نے دو مصرع پڑھے:

تو ز لب سخن کشادی ہمہ خلق بے زبان شد

تو بہ خرام کردی، ہمہ دیدہ ہا روان شد

پھر آپ نے فرمایا کہ ایک دن میں ان کی تذکیر میں شدت ذوق سے بے خود ہو گیا۔ (میں نہیں کہہ سکتا تھا) کہ میں مر گیا ہوں یا مجھے کیا ہوا ہے۔ اس سے پہلے میری یہ حالت سماع یا کسی اور موقع پر نہیں ہوئی تھی۔ یہ واقعہ اس زمانے

سے پہلے کا ہے جب میں شیخ فرید کی خدمت میں پہنچا ہوں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ ایک عزیز نے قاضی منہاج سے کہا: 'تم قضا کے لائق نہیں ہو۔ تم اس لائق ہو کہ شیخ الاسلام بنو' (۱۴؍رمضان ۱۲ے۷ھ)"

اس کے بعد سماع کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ حضور نے فرمایا کہ سماع کا سکہ اس شہر میں قاضی حمید الدین ناگوری نے رائج کیا ہے۔ ان کے بعد جب قاضی منہاج الدین قاضی مقرر ہوئے تو وہ بھی صاحب سماع تھے۔ ان دونوں کی وجہ سے سماع کو استقامت حاصل ہوئی۔ (۱۰؍شوال ۲۰ے۷ھ)

مولانا نور ترک۔" حکایت مولانا نور ترک شروع ہوئی۔ بندہ نے عرض کیا کہ بعضے علماء حضرت دہلی ان کے دفن کے بارے میں اعتراض کرتے ہیں۔ حضور نے کہا 'نہیں! وہ آسمان کے پانی سے زیادہ پاک تھے'۔ میں نے عرض کیا کہ طبقاتِ ناصری میں لکھا ہے کہ وہ علمائے شریعت کو ناصبی اور مرجی کہتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ان کو علماء شہر سے بڑی نفرت تھی چونکہ آپ دیکھتے تھے کہ وہ آلودۂ دنیا ہیں اور علماء بھی ان پر یہ اعتراض کرتے تھے۔ بندے نے پوچھا کہ ناصبی اور مرجی کون ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ناصبی رافضی کو کہتے ہیں، اور مرجی وہ طائفہ ہے جو ہمیشہ خدا کی رحمت کا ذکر کرے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ مرجی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک مرجیٔ خالص اور دوسرا مرجیٔ غیر خالص۔ مرجیٔ خالص وہ ہے جو ہمیشہ رحمت کا ذکر کرے۔ مرجیٔ غیر خالص وہ ہے جو رحمت اور عذاب دونوں کا ذکر کرے۔ اور (صحیح) مذہب یہی ہے۔

پھر آپ نے مولانا نور ترک کی حکایت بیان کی۔ ان میں 'سخن گیرا' تھا یعنی زبان میں تاثیر تھی۔ کسی کے مرید نہیں تھے۔ جو کچھ کہتے تھے وہ قوتِ علم اور قوتِ مجاہدہ سے کہتے تھے۔ آپ کا ایک بہینا غلام تھا جو آپ کو ہر روز ایک جیتل

دیتا تھا اور یہی آپ کا ذریعۂ معاش تھا۔ پھر آپ نے بیان کیا کہ جب مولانا ترک مکّہ گئے اور وہاں مقیم ہو گئے تو اس ملک کا ایک شخص وہاں گیا اور دو من چاول آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ آپ نے قبول کر لیے اور اس کو دعا دی۔ واقعہ یہ ہے کہ سلطان رضیہ نے ایک دن ایک بورا سونے کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا آپ کے پاس بھیجا۔ آپ نے اس کو رد کر دیا۔ آپ کے ہاتھ میں لکڑی تھی، آپ نے اس لکڑی کو سونے (سے بھرے ہوئے بورے) پر مارا اور کہا 'یہ کیا ہے' اس کو میرے سامنے سے لے جاؤ۔ الغرض جب اس شخص نے دیکھا کہ آپ دو من چاول اس سے مکّہ میں قبول کر رہے ہیں، تو اس کے دل میں گزرا کہ کیا یہ وہی بزرگ ہیں جنھوں نے دہلی میں اتنا سونا لینے سے انکار کیا تھا۔ مولانا ترک نے کہا: "اے خواجہ! آپ مکّہ کو دہلی پر قیاس نہ کیجیے۔ اس زمانے میں میں جوان تھا، اب بڈھا ہو گیا ہوں اور وہ قوت اور گرم جوشی مجھ میں نہیں رہی ہے۔ علاوہ ازیں یہاں غلّہ بہت گراں ہے۔"

اس کے بعد حضور نے فرمایا کہ ایک وقت یہ بزرگ ہانسی گئے اور وہاں تذکیر کی۔ میں نے شیخ فرید کو کہتے سُنا ہے: "میں نے ان کی بہت تذکیریں سنی ہیں۔ جب وہ ہانسی آئے اور اپنی تذکیر شروع کی تو میں بھی اس کو سننے گیا۔ میرے کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے تھے اور ہم دونوں میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جیسے ہی میں مسجد میں داخل ہوا اور ان کی نظر میرے اوپر پڑی، آپ نے کہا: 'اے مسلمانو! سخن کا پرکھنے والا آگیا ہے'۔ اس کے بعد آپ نے میری اتنی تعریف کی جیسی کہ کسی بادشاہ کی بھی نہ کی ہوگی۔ (۱۱ر شعبان ۷۱۸ھ)

نظام الدین ابو المؤید۔ یہ اس زمانے کے ایک مشہور بزرگ تھے۔ جب بارش نہ ہوتی تو لوگ ان سے درخواست کرتے کہ آپ بارش کے لیے دعا کیجیے۔

بندے نے دریافت کیا کہ آپ نے ان کی تذکیر سنی ہے۔ حضور نے جواب دیا ہاں۔ لیکن میں اس زمانے میں کم سن تھا اور معانی کو حسب مراد نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ایک بار ان کی تذکیر میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ مسجد کے دروازے پر آکر آپ نے جوتے اتار کر ہاتھ میں لیے۔ پھر مسجد میں آکر دو رکعتیں نماز کی پڑھیں۔ میں نے اس ہیئت سے سکون کے ساتھ کسی کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ پھر آپ منبر پر گئے۔ قاسم نام ایک خوش خواں قاری تھا، اس نے ایک آیت پڑھی۔ پھر آپ نے اپنی تذکیر یوں شروع کی: 'میں نے اپنے بابا کے ہاتھ کی تحریر دیکھی ہے۔' آپ نے یہ جملہ ختم نہیں کیا تھا کہ آپ کے کلام کا مجمع پر اتنا اثر ہوا کہ سب رونے لگے۔ پھر آپ نے یہ شعر پڑھا:

بر عشق تو و بر تو نظر خواہم کرد

جان در غم تو زیر و زبر خواہم کرد

آپ کا یہ کہنا تھا کہ مجمع سے نعرے اٹھے۔ آپ نے دو تین بار یہ شعر دہرایا۔ پھر آپ نے کہا، اے مسلمانو! دو مصرع اور ہیں جو مجھے یاد نہیں آتے ہیں۔ کیا کروں؟ یہ بات آپ نے ایسے عاجزانہ طریقے سے کہی کہ تمام مجمع پر اثر ہوا۔ پھر قاسم مقری نے وہ دو مصرع یاد دلائے۔ شیخ نے رباعی تمام کی (اور تذکیر کے بعد) منبر سے اتر آئے۔ (۱۸ ربیع الآخر ۷۱۸ھ)

تیسرا باب

خلافتِ شیخ فرید

سیر العارفین کا بیان غالباً صحیح ہے کہ حضور کی عمر پچیس برس کی تھی جب آپ بداؤں سے دہلی اعلیٰ تعلیم کے لیے تشریف لائے۔ حضور نے ایک دن اپنی محفل میں فرمایا کہ میں تین دفعہ شیخ فریدالدین مسعود کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ہر سال ایک بار، اور چھ یا سات دفعہ ان کی قبر کی زیارت کی ہے، اغلب یہ ہے کہ سات دفعہ، چونکہ میرا گمان غالب یہ ہے کہ میں دس دفعہ اجودھن گیا ہوں۔ شیخ جمال الدین ہانسوی نو بار شیخ فرید کی خدمت میں آئے اور شیخ نجیب الدین متوکل اُنیس بار۔ (۲۷ ر ذیقعدہ ۷۰۹ھ)

پہلا سفر۔ یہ شیخ فرید کی زندگی کے آخری تین یا چار سال تھے۔ شیخ کبیر نے اپنی تعلیم ختم نہیں کی تھی کہ آپ اجودھن کے لیے یا حافظ، یا ناصر، یا معین کے وظیفے کے ساتھ روانہ ہو گئے (۲۹ ر جمادی ۷۱۸ھ)

آپ نے اپنی پہلی ملاقات کا یوں ذکر کیا ہے۔ "میں جب شیخ فرید کی خدمت میں پہنچا تو میرا ارادہ تھا کہ میں جو کچھ ان کی زبان مبارک سے سنوں، اس کو لکھ لوں۔ پہلا کلام جو میں نے شیخ فرید کی زبان سے سنا، یہ شعر تھا۔

ای آتش فراقت دلہا کباب کردہ   سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

میں چاہتا تھا کہ آپ کی خدمت میں اُس اشتیاقِ پائے بوس کا حال جو میرے دل میں تھا، اجمالی طور سے عرض کردں۔ لیکن حضور کے خوف کی وجہ سے صرف اتنا کہہ سکا کہ حضور کے قدم چومنے کی خواہش مجھ پر غالب ہوگئی تھی۔ شیخ فرید نے میرے خوف کو دیکھ کر فرمایا: لِکُلِّ دَاخِلٍ دھشۃٌ (ہر آنے والے پر دہشت ہوتی ہے)۔ الغرض اس روز جو کچھ میں نے شیخ فرید سے سُنا تھا اپنی جگہ آکر قلمبند کرلیا اور یہ بات شیخ فرید پر بھی ظاہر کردی۔ اُس کے بعد ہر حکایت یا اشارہ جو آپ بیان کرتے تھے، تو میرے بارے میں پوچھتے کہ حاضر ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو جو کچھ میری غیبت میں فرماتے اُس کو میرے آنے کے بعد پھر دُہراتے تھے۔ پھر حضور نے فرمایا کہ اُس زمانے میں ایک کرامت جو میں نے دیکھی یہ تھی۔ ایک شخص نے سفید کاغذ جلد بندھا ہوا مجھے دیا اور میں نے قبول کرلیا۔ جو کچھ میں نے لکھا تھا اس کو اس میں درج کرلیا۔ اس کے بعد جو کچھ میں نے شیخ فرید سے سُنا اس کو لکھتا رہا۔ یہ مجموعہ اب تک میرے پاس ہے[1] (۸ رشوال ۷۰۷ھ)

فوائدالفواد میں شیخ فرید کا چالیس یا پچاس بار ذکر آیا ہے۔ یہاں شیخ فرید کے تمام حالاتِ زندگی لکھنا ممکن نہیں۔ آپ کی زندگی پر ایک کتاب میرے گرامی دوست پروفیسر خلیق احمد نظامی انگریزی میں شائع کرچکے ہیں۔ مجھے صرف آپ کی آخری عمر کے تین چار سال سے تعلق ہے جن میں حضور آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ بدقسمتی سے شیخ کبیر کے بیان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کیا واقعات آپ کی پہلی دوسری یا تیسری حاضری میں پیش آئے۔ ایک حد تک اندازے سے کام لینا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی آپ تینوں حاضریوں کے واقعات ایک ہی جگہ بیان کردیتے ہیں۔

---

[1] یہ مجموعہ ذاتی یادداشت تھی۔ شائع کرنے کا کبھی مقصد نہ تھا۔

شیخ فرید کی عمر نوے برس کے قریب ہو چکی تھی۔ آپ کمزوری کی وجہ سے فرض رکعتوں کے علاوہ باقی رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے تھے (۲۷ رمضان ۷۱۸ھ) ایک محفل میں آپ نے شیخ فرید کے بارے میں فرمایا: "شیخ فرید کا افطار اکثر شربت سے ہوتا تھا۔ آپ کے پاس ایک بھرا پیالہ شربت کا لاتے تھے جس میں چند سوکھے انگور یا منقے پڑے ہوتے تھے۔ کچھ حصہ اس کا آپ اپنے لیے ایک برتن میں ڈال دیتے اور باقی آدھا یا دو حصے حاضرانِ محفل میں تقسیم کر دیتے۔ ایک تہائی جو باقی رہتا تو اس میں سے بھی اگر کسی کی خوش نصیبی ہوتی تو اس کو دیتے۔ نمازِ مغرب سے پہلے دو روٹیاں جن پر گھی ملا ہوا ہوتا تھا لائی جاتیں۔ ان دو روٹیوں کا وزن کم از کم ایک سیر ہوتا۔ ان دو روٹیوں میں سے ایک کو آپ ٹکڑے ٹکڑے کر کے حاضرانِ محفل میں تقسیم کر دیتے، دوسری روٹی کو آپ خود کھاتے، لیکن اگر آپ چاہتے تو دوسروں کو بھی اس میں حصہ دیتے۔ اس کے بعد آپ عبادتِ خدا میں مشغول ہو جاتے، مشغولی بدلِ تمام۔ اس کے بعد رات کا کھانا ہر قسم کا آتا۔ اس کھانے کے بعد آپ دوسری شام کے افطار تک کچھ نہ کھاتے۔"

اس کے بعد حضور نے فرمایا کہ آپ کو خلہ[1] کی تکلیف تھی اور اسی میں آپ کا انتقال ہوا۔ حضور نے فرمایا کہ ایک دن شیخ فرید کے سونے کے وقت میں حاضر تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک کھاٹ بچھایا گیا۔ وہ کمل جس پر آپ دن کو بیٹھتے تھے اس کو کھاٹ کے اوپر بچھایا۔ کمل کھاٹ کے آخر تک نہیں پہنچتا تھا۔ جہاں آپ کے پیر ہوتے تھے۔ ایک کپڑے کے ٹکڑے (شقہ) کو لائے اور پائینتی بچھا دیا۔ اگر اس شقہ کو آپ رات کو اپنے اوپر کھینچ لیتے تو پیر کی جگہ خالی رہتی۔

---

[1] ایک قسم کا درد۔

ایک عصا تھا جو آپ کو شیخ قطب الدین نے دیا تھا۔ اس کو لاتے اور کھاٹ کے سرپر رکھ دیتے۔ شیخ فرید اس عصا پر تکیہ کرکے آرام کرتے۔ آپ عصا پر ہاتھ پھیرتے اور اس کو چومتے۔

پھر فرمایا کہ ایک روز اسی بیماری میں مجھ سے اور میرے چند یاروں سے کہا کہ فلاں مقبرے میں جاؤ، رات بھر جاگو اور میری صحت کے لیے دعا کرو۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ مقبرے میں گیا۔ مقبرے کی چھت تھی، ہم چھت پر گئے، کھانا اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ رات بھر وہاں رہے اور دعا کی۔ جب صبح ہوئی تو ہم لوگ آئے اور آپ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور عرض کیا کہ آپ کے حکم کے مطابق ہم لوگ رات بھر جاگتے رہے اور دعا کی۔ شیخ فرید تھوڑی دیر تک خاموش رہے اور پھر کہا: "تمھاری اس دعا کا میری بیماری پر کوئی اثر نہیں ہوا!" شیخ کبیر نے فرمایا کہ اس جواب سے میں سوچ میں پڑ گیا۔ میرے ایک دوست علی بہاری نام، میرے پیچھے کھڑے تھے انھوں نے دھیں سے کہا کہ ہم لوگ ناقص ہیں، ذات مبارک شیخ کامل ہے، ناقصوں کی دعا کاملوں کے حق میں کس طرح قبول ہو سکتی ہے؟ ظاہر تھا کہ شیخ نے اس بات کو نہیں سنا۔ میں نے عین ان الفاظ کو شیخ کے کانوں تک پہنچایا۔ شیخ فرید نے میری عزت رخ کیا اور کہا کہ میں نے خدا سے دعا کی ہے کہ جو کچھ تو خدا سے چاہے گا وہ تجھے مل جائے گا۔ پھر آپ نے اپنا عصا مجھے دیا۔"

بندے نے دریافت کیا کہ کیا آپ شیخ فرید کے انتقال کے وقت موجود تھے؟ آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور آپ نے فرمایا کہ شوال کے مہینے میں مجھے دہلی بھیج دیا اور آپ کا انتقال پانچ محرم کی رات کو ہوا۔ رحلت سے پہلے آپ نے مجھے یاد کیا اور کہا کہ وہ دہلی میں ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ شیخ

قطب الدین کی رحلت کے وقت میں ہانسی میں تھا اور حاضر نہ تھا۔ یہ فرمانے کے بعد حضور کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس کا تمام حاضرین پر اثر ہوا۔ اس کے بعد آپ نے یہ حکایت بیان کی۔ جب رمضان کا مہینہ آیا تو شیخ فرید کی تکلیف بڑھ گئی اور آپ روزہ رکھنے سے معذور ہو گئے۔ ایک دن خربوزے آئے اور وہ کاٹ کر شیخ فرید کے سامنے رکھ دیے گئے۔ شیخ فرید نے خربوزے کھائے اور ایک پھانک خربوزے کی مجھے دی۔ میں چاہتا تھا کہ کھاؤں۔ میں نے دل میں ارادہ کر لیا کہ ماہ رمضان کے روزہ توڑنے کے کفارے میں دو مہینے کے روزے متصل رکھوں گا۔ لیکن یہ نعمت جو شیخ مجھے اپنے ہاتھ سے دے رہے ہیں، پھر کہاں ملے گی؟ لیکن شیخ فرید نے کہا کہ ایسا مت کرو۔ مجھے رخصت شرعی ہے۔ تم کو نہ کھانا چاہیے۔ پوچھا گیا کہ عمر شیخ فرید کی کیا تھی۔ آپ نے فرمایا کہ نوے اور تین سال۔ (۲۷ ربیع الاول ۷۱۰ھ)

پھر شیخ فرید کا ذکر ہوا۔ حضور نے فرمایا کہ ان کی روش دوسری تھی۔ انھوں نے خلقِ خدا کو چھوڑ کر دشت اور بیابان اختیار کیا یعنی اجودھن میں ساکن ہوئے اور درویشانہ روٹی پر اور ان چیزوں پر جو اس مقام پر آگتی ہیں، از قسم پیلو وغیرہ، قناعت کی۔ باوجود اس کے آدمیوں کے آنے جانے کی حد نہ تھی۔ خانقاہ کا دروازہ کم و بیش آدھی رات کو بند کیا جاتا تھا۔ نقد، طعام اور سب دوسری نعمتیں خدا کے فضل سے آنے اور جانے والے کو دی جاتی تھیں۔ کوئی شخص آپ کی خدمت میں نہ آتا تھا جس کے سامنے کچھ پیش نہ کیا جائے۔ عجیب قوت اور عجیب زندگانی! بنی آدم میں سے کسی کو یہ میسر نہیں ہوئی۔ اگر ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا جو پہلے کبھی نہیں آیا تھا اور دوسرا چند سالوں کا دوست ہوتا تو آپ گفتگو، توجہ اور تلطف میں دونوں کو برابر اور

مساوی سمجھتے۔ پھر حضور نے فرمایا کہ شیخ بدرالدین اسحاق کہ میں نے کہتے سنا ہے:
"میں شیخ فرید کا محرم خاص تھا، ہر معاملے میں مجھ سے گفتگو کرتے، اور جو
کچھ مجھ سے اکیلے میں کہتے وہی سب کے سامنے بھی کہتے۔ کبھی انھوں نے
مجھ سے اکیلے میں ایسی بات نہ کہی جو اوروں کے سامنے نہ کہتے۔ آپ کے
ظاہر اور باطن کی ایک روش تھی اور یہ عجائب روزگار ہے۔ (۱۳ رجمادی الاول
۷۱۳ھ)۔

جب شیخ کبیر اجودھن پہنچے تو شیخ فرید کے خلیفہ اور داماد شیخ بدرالدین
اسحاق، آپ کے جماعت خانے کے تمام معاملات سنبھالتے تھے اور وہ سب
کام کرتے تھے جو آج کل ایک نائب (سکریٹری) کرتا ہے۔ جیسا ہم آگے چل کر
دیکھیں گے، یہ بات شیخ فرید کے بیٹوں کو گراں گزرتی تھی۔ لیکن شیخ کبیر اور
شیخ اسحاق میں ایک گہری محبت قائم ہوگئی۔ امیر خورد کہتے ہیں کہ آخری سالوں
میں شیخ فرید کو بڑی تنگی معاشں اور افلاس کا سامنا کرنا پڑا۔ رمضان شریف
میں اتنا کھانا نہیں پکتا تھا کہ کوئی بھی سیر ہو کر کھا سکے[1]۔ اجودھن پہنچنے کے
چند دن بعد شیخ کبیر نے طے کیا کہ محلوق ہو جائیں گے اور شیخ اسحاق نے
اس کا انتظام کرادیا۔ شیخ فرید نے اس کا بھی حکم دیا کہ شیخ کبیر کے لیے ایک
کھاٹ جماعت خانے میں ڈال دی جائے۔ آپ کو اس پر اعتراض ہوا کہ
یہاں بہت بزرگ ہیں جو زمین پر سو رہے ہیں۔ میں کس طرح کھاٹ پر سو سکتا
ہوں۔ شیخ اسحاق نے شیخ فرید سے گفتگو کی اور آپ سے پوچھا کہ تم اپنے پیر
کی اطاعت کرو گے یا اپنے من مانے راستے پر چلو گے؟ ظاہر ہے کہ آپ

---

[1] سیر الاولیاء۔ باب اول۔ شیخ فرید۔ نکتہ سوم۔

کے لیے اس کا ایک ہی جواب تھا۔[1] جب آپ نے شیخ فرید سے اپنی آیندہ زندگی کے بارے میں پوچھا تو شیخ فرید نے کہا کہ میں کسی کو تحصیلِ علم سے نہیں روکتا۔ تم تحصیل علم بھی جاری رکھو اور عبادت بھی جاری رکھو۔ قطرۃً ایک کا پلّہ بھاری ہو جائے گا۔ آپ کو دہلی واپس جانے کی اجازت دی گئی اور شیخ فرید کے حکم کے مطابق آپ کو ایک سلطانی بھی دی گئی، لیکن شیخ اسحاق نے کہا کہ تم آج ٹھہر جاؤ، کل جانا۔ افطار کے وقت سے کچھ پہلے شیخ کبیر کو معلوم ہوا کہ یہ شیخ فرید کی خانقاہ کا آخری سکہ ہے اور افطار اور رات کے کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ آپ شیخ فرید کے سامنے گئے اور ان کی خدمت میں وہ سلطانی[2] پیش کی۔ شیخ نے وہ سلطانی قبول کرلی اور آپ کے لیے چند دعائیہ کلمے زبانِ مبارک سے فرمائے۔

واپسی میں شیخ کبیر کا مولانا داؤد پالکی کا ساتھ ہوا۔ آپ نے فرمایا: "ہم دونوں شیخ فرید کو ایک ہی وقت وداع کرکے باہر آئے۔ ان کے ڈگ لمبے تھے۔ وہ تیز چلتے اور نماز میں مشغول رہتے جب تک کہ میں نہ پہنچ جاتا۔ جب مجھے ان کا مزاج معلوم ہوا تو میں بھی تیز چلا۔ اور وہ نماز ہی میں ہوتے تھے کہ میں ایک دو کروہ (کوس) آگے پہنچ جاتا۔ وہ میرے پیچھے آتے اور ایک دو کروہ مجھ سے آگے نکل کر نماز میں مشغول ہو جاتے اور ایسے جنگل اور بیابان میں اپنا راستہ نہ بھولتے۔"[3] اس کے بعد شیخ نصیر الدین محمود نے فرمایا کہ میں مولانا داؤد پالھی سے ملا ہوں۔ وہ اودھ میں ردولی کے نزدیک ایک گاؤں میں رہتے تھے۔

---

[1] سیر الاولیا، شیخ نظام الدین، نکتۂ پنجم (باب اول)

[2] سلطانی سے یہاں غالباً سونے کا تنکہ مراد ہے۔

[3] خیر المجالس، مجلس سی و پنجم۔

حضور فرماتے ہیں: "شیخ فرید نے مجھ سے بار بار کہا کہ "دشمنوں کو خوش کرنا چاہیے۔ اور مستحقوں کو راضی رکھنے میں کوشش کرنا چاہیے" (۷ رجب ۷۱۵ھ)
"مجھے یاد آیا کہ مجھے بیس جیتل قرض ادا کرنا ہے اور ایک کتاب جو میں نے کسی سے عاریتہً لی تھی، مجھ سے گم ہو گئی ہے۔ قرض بزاز کا تھا جس سے میں نے کپڑا لیا تھا۔ لیکن معاش کی تنگی کی وجہ سے کبھی بیس جیتل میرے ہاتھ میں نہ آتے کبھی میرے پاس پانچ جیتل ہوتے اور کبھی دس جیتل۔ ایک وقت جب میرے پاس دس جیتل تھے، میں اُس بزاز کے گھر پر گیا اور اس کو آواز دی۔ وہ باہر آیا۔ میں نے کہا کہ تمھارے بیس جیتل میرے ذمے ہیں لیکن مجھے میسر نہیں ہیں کہ ان کو ایک ہی وقت ادا کر دوں۔ اس وقت میں دس جیتل لایا ہوں۔ باقی رقم انشاء اللہ جلدی پہنچا دوں گا۔ بزاز نے کہا۔ تم شیخ فرید کے یہاں سے آئے ہو۔ وہ دس جیتل مجھ سے لے لیے اور کہا کہ باقی دس جیتل میں نے تم کو معاف کر دیئے۔ پھر میں اُس شخص کے پاس گیا جس کی کتاب میں نے کھو دی تھی۔ اس نے پوچھا کہ تم کیسے ہو؟ میں نے کہا: اے خواجہ! میں نے تم سے ایک کتاب عاریتہً لی تھی جو مجھ سے کھو گئی ہے۔ اب میں اس کا نسخہ حاصل کر کے دوسری کتاب اسی طرح کی لکھوا کر تمھارے پاس پہنچوا دوں گا۔ اس شخص نے یہ سنکر کہا: جس جگہ سے تم آئے ہو اس کا یہی پھل ہے۔ میں نے وہ کتاب تم کو بخش دی۔ (۷ رجب ۷۱۵ھ)۔

دہلی میں شیخ فرید کے مخالفین بھی تھے۔ امیر خورد لکھتے ہیں: "شیخ کبیر نے فرمایا ہے کہ جب میں سر منڈا کر اجودھن سے دہلی واپس آیا اور اس اُونی خرقے کو جو شیخ فرید نے مجھے دیا تھا پہن کر جامع مسجد میں گیا تو شرف الدین قیامی نے مجھے بلا بھیجا۔ میں نے اپنی بیعت اور خلعت حاصل کرنے کا حال اُن سے بیان

گیا یہ سن کر انھوں نے حضرت شیخ فرید کے بارے میں اپنے الفاظ استعمال کیے
جو ان کے شایانِ شان نہ تھے اور مجھے کچھ بہت برا بھلا کہا۔ میں جواب دے
سکتا تھا لیکن میں نے تحمل کو بہتر سمجھا۔ جب میں نے شیخ فرید سے یہ حال بیان
کیا تو وہ سنتے گئے اور میرے تحمل کی تعریف کی۔ آپ کی زبان سے تعریف سن کر
جو خوشی مجھے ہوئی اس سے مجھے خیال ہوا کہ شیخ شرف الدین قیامی حق پر ہیں۔ جب
میں دہلی واپس آیا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔[1]

حضور نے فرمایا کہ میں نے ایک خط عرض داشت شیخ فرید کی خدمت میں بھیجی
جس میں شروع میں یہ رباعی درج کی تھی

آں روز کہ بندہ ام بخوانند مرا
بر مرکب دیدہ تا نشانند مرا
لطف تو عنایتی فرمودست
ورنہ چہ کسم خلق چہ دانند مرا

(۱۲ر شعبان سنہ ۷۱۷ھ)

دوسرا سفر:- "جب میں شیخ فرید کی خدمت میں پہنچا تو انھوں نے یہ رباعی پڑھی اور کہا کہ میں نے اس کو یاد کر لیا ہے۔" (۱۲ر شعبان سنہ ۷۱۷ھ)

اس دفعہ شیخ فرید نے حضور کو ایک مرید کے درجے سے ایک خلیفہ کے درجے تک پہنچانے کی کوشش شروع کی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ میں نے قرآن کے چھ پارے اور دو کتابیں شیخ فرید سے پڑھی ہیں اور تیسری کتاب کی سماعت کی ہے۔ اس دن میں نے عرض کیا کہ میں حضور سے قرآن پڑھنا چاہتا ہوں۔

---

[1] سیر الاولیاء، باب اول، شیخ فرید الدین۔ نکتہ: ہشتم۔

آپ نے فرمایا، اچھا پڑھو۔ اس کے بعد جمعہ کے دن یا جب بھی آپ کو فرصت ہوتی میں آپ سے کچھ قرآن پڑھتا۔ یہاں تک کہ میں نے آپ سے چھ پارے پڑھے۔ جب میں نے شروع کیا تو آپ نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے پڑھنے کا طریقہ مجھے بتایا۔ جب وَلَا الضَّآلِّیْنَ پر پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ ضاد کو اس طرح پڑھو جیسا کہ میں پڑھتا ہوں، میں نے بہت کوشش کی لیکن اس طرح نہ پڑھ سکا جیسے آپ پڑھتے تھے۔ پھر حضور نے فرمایا کہ شیخ فریدؔ میں کیا فصاحت اور بلاغت تھی۔ آپ ضاد کا ایسا تلفظ کرتے تھے کہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔

(۲۹ رجب ۷۱۱ھ)

جن دو کتابوں کے پڑھنے کا آپ نے ذکر کیا ہے ان میں سے ایک ابو شکور سالمی کی تمہید المہتدی تھی، جس کو آپ نے شیخ فرید سے سبقاً بعد سبقٍ شروع سے آخر تک پڑھا ہے اور جس کے پڑھانے کا اجازت نامہ آپ کو شیخ فرید نے دیا تھا۔ اجازت نامہ کے عین الفاظ (جو خلافت نامہ بھی تھا) سیر الاولیاء میں دیے ہوئے ہیں[1]۔

دوسری کتاب عوارف المعارف تھی جس کو ہندوستان کے سب صوفی گروہوں میں اس وقت مقبولیت حاصل تھی۔ "کچھ ذکر عوارفِ شیخ شہاب الدین (سہروردی) کا ہوا۔ حضور نے فرمایا کہ میں نے پانچ باب عوارف کے شیخ فرید سے پڑھے ہیں۔ پھر فرمایا کہ شیخ فرید کا بیان اس خوبی کا ہوتا تھا کہ کوئی دوسرا اس کو نہیں پہنچ سکتا۔ اکثر ان کے بیان سے ایسا ذوق پیدا ہوتا تھا کہ سننے والا چاہتا تھا کہ اگر فوراً جان دے دے تو اچھی موت ہوگی۔ پھر حضور نے فرمایا کہ

---

[1] باب اول، شیخ نظام الدین اولیاء، نکتہ ہشتم۔

جب پہلی دفعہ عوارف کا نسخہ شیخ فرید کو دستیاب ہوا تو آپ کے گھر اسی دن ایک لڑکا پیدا ہوا اور آپ نے اس کا نام شہاب الدین رکھا (۱۲ ر جمادی دوم ۶۱۷ھ) یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ تیسری کتاب کیا تھی۔

اسی زمانے میں ایک واقعہ ہوا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور کے دل میں اپنے پیر کی کتنی عزت تھی اور شیخ فرید کو آپ سے کتنی محبت تھی۔" ایک بار مجھے بھی اپنے شیخ کی خدمت میں بغیر ارادہ کے جرأت ہوئی۔ ایسا ہوا کہ ایک دن عوارف کا نسخہ شیخ فرید کے سامنے تھا اور آپ اس کے فوائد بیان کر رہے تھے۔ شیخ کو اس کے پڑھنے میں کچھ وقت ہو رہی تھی، کتاب کا نسخہ یا بہت باریک قلم سے لکھا تھا یا غلط تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک نسخہ عوارف کا شیخ نجیب الدین متوکل کے پاس دیکھا تھا، اس لیے میری زبان سے نکلا کہ شیخ نجیب الدین کے پاس صحیح نسخہ ہے۔ آپ کی خاطر پر یہ جملہ گراں گزرا' اور آپ نے فرمایا: اِس درویش کو نسخۂ سقیم کے صحیح کرنے کی قوت نہیں ہے! آپ نے دوبارہ یہ جملہ دہرایا مگر میرے دل پر نہیں گزرا کہ آپ کی مراد کیا ہے اگر میں نے ارادۃً اور عمداً یہ (گستاخی کی) بات کہی ہوتی تو مجھے گمان ہوتا کہ شیخ یہ بات میرے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ جب آپ نے تیسری بار یہی کہا تو مولانا بدر الدین اسحاق نے کہا کہ شیخ فرید یہ بات تمھارے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اور سر برہنہ کر کے شیخ کے پیروں پر گر پڑا اور معذرت کی: نعوذ باللہ! میرا قصد مخدوم پر اشارہ کرنے کا نہ تھا۔ میں نے ایک نسخہ دیکھا تھا اور اس کا ذکر کیا، کوئی اور بات بالکل میرے دل میں نہیں تھی"۔ باوجود اس معذرت کے میں نے شیخ کے چہرے پر ناراضامندی کا اثر اسی طرح دیکھا۔ جب میں وہاں سے باہر آیا تو میں نہیں جانتا

تھا کہ میں کیا کروں۔ خدا کسی کو ایسا دن اور ایسا غم نہ دکھائے جو مجھے اس وقت تھا روتا ہوا مضطرب اور حیران میں باہر آیا اور ایک کنویں پر پہنچا۔ میں چاہتا تھا کہ کنویں میں کود پڑوں۔ لیکن میں نے تامل کیا اور اپنے دل میں کہا کہ مردہ فقیر موت کو پکڑے۔ لیکن خدا جانے اس کے لیے کون بدنام ہو۔ اس پریشانی اور حسرت میں میں روتا صحرا کی طرف گیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس وقت میرا کیا حال تھا۔ الغرض شیخ فرید کے ایک بیٹے شہاب الدین تھے۔ ان کے اور میرے درمیان بہت محبت تھی۔ جب ان کو اس بات کی خبر ہوئی تو وہ شیخ فرید کے پاس گئے اور میرا حال خوبی کے ساتھ بیان کیا۔ شیخ فرید نے ان کو مجھے ڈھونڈھنے کے لیے بھیجا۔ میں آپ کی خدمت میں آیا اور اپنا سر آپ کے قدم مبارک پر رکھ دیا۔ آپ خوش ہو گئے۔ دوسرے دن آپ نے مجھے بلایا اور کہا کہ یہ سب میں نے تیرے حال کی تکمیل کے لیے کیا تھا۔ اس دن میں نے آپ کی زبان سے یہ بات سنی کہ پیر مشاطۂ مرید ہوتا ہے۔ پھر مجھے آپ نے خلوت دی اور اپنے خاص لباس سے مشرف کیا (۲۵ رشعبان ۷۰۸ھ)

شیخ فرید کا چلۂ معکوس بہت مشہور ہے۔ لیکن شیخ کبیر فرماتے ہیں کہ آپ کو تمام عمر یہ غم رہا کہ یہ بات اپنے پیر شیخ قطب الدین کی رائے کے خلاف میں نے کیوں کی۔ اس قسم کی عبادتیں جن میں جسمانی تکلیف کا جز بہت زیادہ ہوتا ہے اور اصل عبادت کا جز بہت کم، ہمارے رسول نے بالکل منع فرما دی ہیں۔ چشتی سلسلہ میں بھی یہ منع تھیں۔ (۲۵ رشعبان ۷۰۸ھ)

شیخ نصیر الدین محمود شیخ کبیر کی سند سے بیان کرتے ہیں کہ جب حضور دہاں تھے شیخ فرید کو سخت بیماری ہوئی جس میں کھانے اور پینے کی خواہش بالکل جاتی رہی۔ اطباء کوئی تشخیص نہ کر سکے اور آپ کی بیماری بڑھتی رہی۔ آپ نے

اپنے یاروں اور مریدوں سے کہا کہ میرے اچھے ہو جانے کے لیے دعا کرو۔ اجودھن میں ایک مشہور جادوگر تھا جس کو شہاب ساحر کہتے تھے۔ اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ شیخ فرید کے بیٹے خواجہ سلیمان نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص ان سے کہہ رہا ہے کہ شہاب ساحر کے بیٹے نے شیخ فرید پر جادو کیا ہے اور ان کو خواب میں ایک عربی جملہ بھی شہاب ساحر کی قبر پر پڑھنے کے لیے بتایا۔ شیخ فرید نے یہ کام شیخ کبیر کے سپرد کیا۔ حضور فرماتے ہیں کہ رات کو میں شہاب ساحر کی قبر پر بیٹھا۔ قبر پکی تھی لیکن اس کے اوپر کچھ مٹی تھی۔ میں نے بے خیالی میں مٹی کو ہٹا دیا اور ایک شگاف کچی قبر میں پایا۔ شگاف کے اندر ہاتھ ڈالنے پر مجھے ایک آٹے کی مورت ملی جس میں بہت سی سوئیاں چھوئی ہوئی تھیں اور جس کے چاروں طرف گھوڑے کی دم کے بال کسے ہوئے تھے۔ میں آٹے کی مورت کو شیخ فرید کے پاس لے گیا۔ آپ نے فرمایا کہ ان سوئیوں کو نکال لو۔ اور مورت کو بہتے ہوئے پانی میں ڈال دو۔ شیخ فرید نے پھر فرمایا کہ میری صحت بالکل درست ہو گئی ہے[1]۔ والیِ اجودھن نے ان لوگوں کو جو اس جرم کے مرتکب تھے، شیخ فرید کے پاس بھیجا اور دریافت کیا کہ ان کو کیا سزا دی جائے۔ شیخ فرید نے جواب دیا کہ ان کو چھوڑ دو، میں نے ان کو معاف کر دیا ہے۔ (۱۲ر شعبان ۷۵۲ھ)

ایک دفعہ ایک بیباک درویش خواجہ فرید کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ تم نے اپنے کو بت بنا کر بٹھایا ہے۔ شیخ نے کہا میں نے کچھ نہیں کیا خدا نے کیا ہے۔ اس نے پھر کہا کہ تم نے کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو کچھ کرتا ہے

---

[1] خیر المجالس، مجلس سی و پنجم، ص ۱۱۶ - ۱۱۷۔

خدا کرتا ہے۔ مدعی پشیمان ہوا اور واپس چلا گیا۔ (۱۵ محرم ۷۱۰ھ)

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ ایک وقت جب میں شیخ فرید کی خدمت میں اجودھن گیا تھا، ایک جوگی آیا اور اس سے میں نے پوچھا کہ تم کس راستہ پر چلتے ہو اور تم لوگوں میں اصل کام کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ہمارے علم کے مطابق دو عالم ہیں، ایک عالم علوی اور دوسرا عالم سفلی۔ سر سے ناف تک عالم علوی ہے اور ناف سے پیر تک عالم سفلی۔ ہمارا کام یہ ہے کہ عالم علوی میں سچائی، صفائی، اچھا اخلاق اور اچھا معاملہ رہے اور عالم سفلی میں احتیاط، پاکی اور پارسائی ہو۔ حضور نے فرمایا کہ یہ بات مجھے اچھی لگی۔ (۲۳ محرم ۷۱۲ھ)

فوائد الفواد میں شمس دبیر کا دوبار ذکر آیا ہے۔ آپ امیر حسن سجزی کے قریبی عزیز تھے۔ آپ نے ایک لمبا قصیدہ شیخ فرید کی تعریف میں لکھا تھا اور اس کے پڑھنے کی اجازت مانگی۔ شیخ فرید نے فرمایا کہ مشائخ شعر کمتر سنتے ہیں اور خاص کر اپنی تعریف میں۔ باوجود اس کے آپ نے شمس دبیر کو قصیدہ پڑھنے کی اجازت دی۔ کچھ اشعار کی آپ اصلاح کرتے تھے اور کچھ اشعار کی تعریف۔ قصیدہ ختم ہونے کے بعد شیخ فرید نے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ شمس دبیر نے کہا کہ میں بہت عسرت کی زندگی بسر کر رہا ہوں اور میری ایک بوڑھی ماں ہے جس کی مجھے پرورش کرنا ہے۔ شیخ فرید نے کہا جاؤ اور شکرانہ لاؤ۔ حضور نے فرمایا کہ جب شیخ فرید شکرانہ لانے کا حکم دیتے تھے تو سائل کی امید ضرور پوری ہوتی تھی۔ الغرض شمس دبیر گئے اور چند جیتل لے آئے۔ اس زمانے میں صرف یگانی جیتل ہوتا تھا[1]۔ شمس دبیر کم و بیش پچاس جیتل لائے۔ شیخ فرید نے کہا کہ ان کو

---

[1] یگانی جیتل یعنی ایک جیتل۔ جیتل تانبے کا سکہ ہوا کرتا تھا۔ سلطان غیاث الدین بلبن کا زمانہ (صفحہ ۸۱ دیکھیے)

حاضرانِ محفل میں تقسیم کردو۔ میرے حصّے میں چار جیتل آئے۔ پھر شیخ نے فاتحہ پڑھا۔ شمس دبیر کی حالت میں مالی وسعت پیدا ہوئی اور وہ سلطان غیاث الدین بلبن کے بیٹے (بغرا خاں) کے دبیر مقرر ہوئے۔ جب شمس دبیر کے حالاتِ زندگی درست ہوئے تو شیخ فرید کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن اس نے شیخ کے بیٹوں اور خاندان کی کوئی خدمت نہ کی۔ یا وہ ان کی حالت نہیں جانتا تھا یا اسے کسی نے اطلاع نہ دی[۱]۔ شیخ حمید الدین ناگوری کی لوائح کو بھی شیخ فرید سے پڑھا تھا۔
(۱۱ ذی الحجہ ۷۱۴ھ)

امیر خورد بیان کرتے ہیں کہ حضور ایک جماعت کے ساتھ، جس میں شیخ جمال ہانسوی اور شمس دبیر بھی تھے، شیخ فرید سے رخصت ہو کر روانہ ہوئے۔ چلتے وقت شیخ فرید نے شیخ جمال ہانسوی کو ہدایت کی کہ شیخ کبیر کا بہت خیال رکھیں۔ جب اگروہہ پہنچے تو میراں نام، حاکم اگروہہ، شیخ جمال کا دوست تھا۔ اس نے سب کی بہت خاطر کی، ان کے لیے ہانسی تک گھوڑے مہیا کیے۔ شیخ کبیر کا گھوڑا بدلگام اور سرکش تھا اور سب سے پیچھے رہتا تھا۔ آپ نے یہ بہتر سمجھا کہ اس سے اُتر کر پیدل چلیں۔ مگر آپ بیہوش ہو کر گر پڑے چونکہ آپ پر صفرا غالب ہو گیا تھا، لیکن اس وقت بھی آپ کے دل میں شیخ فرید کی یاد رہی[۲]۔

(صفحہ ۸۰ سے آگے) تھا۔ بعد میں چھوٹے چاندی کے سکّے مثلاً ششگانی (چھ جیتل کے برابر) اور دوازدہ گانی (بارہ جیتل کے برابر) بھی رائج ہوئے۔ یہ سکّے غالباً اس چاندی کی وجہ سے بن سکے جو سلطان علاء الدین نے دکن سے حاصل کی تھی۔

[۱] اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ شمس دبیر بغرا خاں کے ساتھ بنگال چلا گیا تھا۔

[۲] سیر الاولیاء۔ باب سوم۔ شیخ جمال ہانسوی۔

غالباً اسی سفر کا واقعہ ہے کہ آپ کو اتنی شدت کی پیاس لگی جس میں جان کا خطرہ تھا۔ آپ کے ایک خوش باش علوی واقف نے، جس کا نام سید عماد تھا، اپنی شراب کی صراحی پیش کی اور کہا کہ پانی یہاں کہیں نہیں مل سکتا ہے حضور نے فرمایا کہ شیخ فرید کی خدمت سے آیا ہوں، مرجاؤں گا لیکن شراب نہیں پیوں گا۔ خوش قسمتی سے تھوڑی دیر چلنے کے بعد پانی مل گیا۔ (۲۱ ذی قعدہ ۷۱۸ھ)

تیسرا سفر۔ اب آپ اپنے پیر کی نظر میں اعلیٰ درجے تک پہنچ گئے تھے۔ کچھ گفتگو نگاہداشت فرمان پیر کے بارے میں شروع ہوئی۔ حضور نے فرمایا کہ ایک روز شیخ فرید کے ہاتھ میں ایک لکھی ہوئی دعا تھی، اور آپ نے پوچھا کہ یہ دعا کون یاد کرلے گا؟ چونکہ میری طرف اشارہ تھا میں نے خدمت کی اور کہا کہ میں یاد کروں گا۔ آپ نے وہ دعا مجھے دی۔ میں نے کہا کہ میں ایک دفعہ یہ دعا آپ سے پڑھ لوں پھر یاد کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ پڑھو۔ جب میں نے پڑھی تو آپ اعراب کی تصحیح کرتے رہے اور کہا کہ اس طرح سے پڑھو۔ میں نے اُس طرح پڑھا جیسا کہ شیخ فرید نے فرمایا تھا۔ حالانکہ جس طرح میں پڑھتا تھا اُس کے بھی معنی نکلتے تھے۔ القصہ میں نے اسی وقت دعا کو یاد کرلیا اور آپ کو اطلاع دی۔ آپ نے فرمایا کہ پڑھو۔ میں نے انھیں اعراب کے ساتھ پڑھا جو شیخ نے بتایا تھا۔ جب میں آپ کی خدمت سے باہر آیا تو مولانا بدرالدین اسحاق نے مجھ سے کہا کہ اعراب اسی طرح سے پڑھا جو شیخ نے بتایا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ اگر سیبویہ، جو اس فن کا بانی ہے، اور وہ سب لوگ جنھوں نے اس علم کے قواعد بنائے ہیں آئیں اور مجھ سے کہیں کہ اعراب اسی طرح ہیں، جیسے کہ تم پڑھتے تھے، میں اس کے بعد بھی اسی طرح سے پڑھوں گا جیسے کہ شیخ نے فرمایا ہے۔ مولانا بدرالدین نے کہا کہ 'وہ آدابِ شیخ جن کا تم لحاظ رکھتے ہو ہم کسی کو میسر نہیں۔ (۹ رمضان ۷۰۸ھ)

شیخ کبیر کی بہت خواہش تھی ان کو تعویذ لکھنے کی اجازت ملے۔ اس سے پہلے جب آپ اجودھن گئے تو آپ کے ایک پڑوسی، محمد نام نے نارو کے مرض کے لیے ایک تعویذ کی درخواست کی۔ شیخ فرید نے کہا لکھ لو۔ پھر ایک دفعہ شیخ فرید کی داڑھی کا بال گر گیا تھا۔ آپ نے ان کی اجازت لے کر اس کا تعویذ بنایا۔ لوگ اس کو لے جاتے تھے اور مریض اچھے ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ آپ کے ایک دوست تاج الدین مینائی کا لڑکا بیمار ہوا۔ وہ تعویذ مانگنے آئے۔ آپ اس تعویذ کو ایک طاق میں رکھ دیتے تھے۔ وہ اس طاق میں نہ تھا اور تمام مکان میں ڈھونڈا لیکن نہ ملا۔ مینائی کے لڑکے کا انتقال ہو گیا، لیکن جب ایک دوسرے مریض کے لیے لوگ تعویذ مانگنے کے لیے آئے تو تعویذ طاق میں رکھا تھا (۷ ذیقعد ۷۱۰ھ)

ایک وقت شیخ بدرالدین اسحاق جو شیخ فرید کی طرف سے تعویذ لکھا کرتے تھے، موجود نہ تھے۔ بہت لوگ تعویذ مانگنے کے لیے آئے۔ شیخ فرید نے میری طرف اشارہ کیا کہ تم تعویذ لکھو۔ لوگوں کا انبوہ تھا۔ مجھے بہت لکھنا پڑا اور سب لوگوں نے پریشان کر دیا۔ شیخ فرید نے میری طرف منہ کیا اور پوچھا کیا تم تھک گئے ہو۔ میں نے کہا شیخ کے فرمان کا مطیع ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تم کو اجازت دیتا ہوں کہ تعویذ لکھو اور دو۔ (۱۱ شعبان ۷۱۸ھ)

اس کے بعد حضور نے فرمایا کہ ایک وقت یہ بیت شیخ فرید نے پڑھی:

نظامی این چہ اسرار است کز خاطر عیان کردی
کسی سر ش نمی داند زبان درکش زبان درکش!

تمام دن یہ شعر آپ پڑھتے رہے۔ افطار اور نماز شام کے وقت بھی یہی شعر زبان مبارک پر تھا۔ کہتے ہیں کہ سحر کے وقت بھی آپ یہ شعر پڑھتے رہے اور جب

آپ پڑھتے تھے تو آپ کے چہرے پر ایک تغیر پیدا ہو جاتا تھا۔ پھر حضور نے فرمایا کہ نہیں معلوم کہ خاطر مبارک میں کیا خیالات آرہے تھے اور آپ کیا سوچتے تھے۔ (۵ رجمادی دوم ۷۱۹ھ)

پھر حضور نے کہا کہ شیخ فرید نے فرمایا ہے کہ زکوٰۃ تین قسم کی ہوتی ہیں: زکوٰۃ شریعت، زکوٰۃ طریقت اور زکوٰۃ حقیقت۔ زکوٰۃ شریعت یہ ہے کہ دو سو درہم میں سے پانچ درہم دے دو۔ زکوٰۃ طریقت یہ ہے کہ دو سو درہم میں سے پانچ اپنے پاس رکھ لو اور باقی دے دو۔ زکوٰۃ حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ دے دو۔ اور اپنے پاس کچھ نہ رکھو۔ (۲۹ رجمادی دوم ۷۱۳ھ)

انھی حروف کے معنی کے بارے میں حضور نے فرمایا کہ یحییٰ معاذ رازی نے کہا ہے کہ ایک ذرّہ محبت کا تمام آدمیوں اور جنّوں کی عبادت سے بہتر ہے۔ شیخ فرید بار بار لوگوں سے کہتے تھے کہ خدا ئے عزّ وجل تم کو درد دے۔ لوگ تعجب کرتے تھے کہ یہ کیا دعا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ اس دعا کے کیا معنی تھے۔ (۲۷ رصفر ۷۱۵ھ)

چشتی سلسلے کے مشائخ حکام اور حکومت کے معاملوں سے دور رہنا چاہتے تھے لیکن حاجت مند ان کو التجا کر کے کبھی مجبور کر دیتے تھے۔ پھر حضور نے فرمایا کہ اجودھن میں ایک عامل تھا جس کو والی (گورنر) نے رنجیدہ کیا تھا۔ عامل شیخ فرید کی خدمت میں حاضر ہوا اور شفاعت کی التماس کی۔ آپ نے کسی کو والی کے پاس بھیجا اور عامل کی سفارش کی۔ والی اپنی روش پر رہا۔ آپ نے عامل سے کہا کہ میں نے تمھاری سفارش کی، شاید اس کے پاس وقت نہیں تھا یا تم سے بھی کسی نے سفارش کی ہے اور تم نے اس کو نہیں سنا ہے۔ اس وقت والی آیا اور معذرت چاہی۔ آپ نے معاف کر دیا۔ (۲۷ ر ذیقعد ۷۱۵ھ)

لہ والی یا مقطع کی حیثیت گورنر کی ایسی ہوتی تھی۔ عامل ایک مقامی افسر تھا جس کے ذمے مالی حسابات ہوتے تھے۔

مباحثے کے بارے میں حضور نے ایک حکایت فرمائی۔ ایک دن ایک بزرگ جو شیخ قطب الدین کے مرید تھے، اپنے بیٹے کے ساتھ شیخ فرید سے ملنے آئے۔ ان کا بیٹا بہت بے ادب تھا۔ وہ شیخ فرید سے بحث کرنے لگا اور اپنی آواز تیز کی۔ شیخ کی آواز بھی تیز ہوگئی۔ یہ سن کر شیخ فرید کے بیٹے مولانا شہاب الدین اندر آئے اور اس لڑکے کے ایک طمانچہ لگایا۔ لڑکا ان سے لڑنے کو تیار ہوگیا لیکن میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شیخ نے حکم دیا کہ صفائی کرو۔ مولانا شہاب الدین کچھ اچھا کپڑا اور چاندی کے سکے لائے اور باپ اور بیٹے کو دیئے۔ وہ دونوں خوش ہوکر چلے گئے۔ شیخ فرید کی رسم تھی کہ ہر روز افطار کے بعد مجھے بلاتے تھے۔ مولانا رکن الدین اور مولانا شہاب الدین کبھی ہوتے اور کبھی نہ ہوتے ..... اس روز افطار کے بعد آپ نے مجھے اور مولانا رکن الدین کو بلایا اور اس روز کا معاملہ پوچھا۔ قصہ سن کر شیخ فرید ہنسنے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ جب وہ لڑکا مولانا شہاب الدین سے لڑنا چاہتا تھا تو میں نے صرف اتنا کیا کہ اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ شیخ فرید پھر ہنسے اور کہا کہ تم نے ٹھیک کیا۔ (۲۸ رجمادی الاول ۷۱۶ھ)

شیخ حمید الدین ناگوری کے نواسے، شرف الدین نام، ناگور سے شیخ فرید کے پاس مرید ہونے کے لیے آئے۔ ان کے پاس ایک قیمتی کنیز تھی جس کی قیمت کم و بیش سو تنکے تھی۔ ان کی کنیز نے ایک بڑا رومال بنا کر آپ کی خدمت میں بھیجا۔ جب یہ رومال شیخ فرید کے سامنے رکھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ خدا اس کو آزادی دے۔ مولانا شرف الدین کچھ دن کم و بیش کے بعد شیخ فرید کی خدمت میں آئے۔ اور کہا کہ میں نے اس کو آزاد کر دیا ہے (۳ ربیع دوم ۷۱۸ھ)

پھر حضور نے فرمایا کہ محمد شہ غوری شیخ فرید کے مریدان صادق اور خوش اعتقادوں میں سے تھے۔ ایک وقت وہ شیخ فرید کے ... اور پریشانی کی

حالت میں آئے۔ آپ نے پوچھا کہ تمھارا کیا حال ہے؟ انھوں نے جواب د
میرا بھائی بہت بیمار ہے اور اس کی آخری سانسیں ہیں۔ اس وقت میں
کی خدمت میں آیا ہوں، کوئی تعجب نہ ہوگا اگر اس کا خاتمہ ہوگیا ہو۔ اس و
سے میں بہت برہم درہم اور زیر وزبر ہوں۔ شیخ فرید نے فرمایا کہ میں تمام عمر ا
ہی رہا ہوں جیسا کہ تم اس وقت ہو، لیکن میں نے کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ پھر آ
نے فرمایا کہ تم جاؤ۔ تمھارا بھائی اچھا ہو جائے گا۔ محمد شہ غوری جب اپنے مکا
پہنچے تو دیکھا کہ ان کا بھائی بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا۔ (۲ر جمادی اول ۷۲۰ھ)

پھر حضور نے فرمایا کہ ایک وقت شیخ فرید نے کہا کہ ایک شخص مجھ سے تعلق
پیدا کرتا ہے لیکن جب میرے پاس سے چلا جاتا ہے تو اس کا مزاج قرار کی
حالت سے بدل جاتا ہے۔ دوسرا ہے جو میرے پاس سے جاتا ہے اور بہت
زمانے تک اس کا مزاج برقرار رہتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا مزاج بھی بدل
جاتا ہے۔ پھر شیخ فرید نے میری طرف اشارہ کیا اور کہا کہ جب سے یہ شخص مجھ سے
ملا ہے، اس کا مزاج اسی طرح کا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے
ان الفاظ کے بعد حضور کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آپ نے فرمایا کہ میری محبت
میرے پیر سے برقرار ہے، بلکہ روز بروز زیادہ ہو رہی ہے۔ (۲۶ر شوال ۷۱۶ھ

امیر خورد لکھتے ہیں کہ ۱۱ر رمضان ۶۶۹ھ (۲۴ر اپریل ۱۲۷۱ء) کو شیخ فر
نے حضور کو بلایا اور کہا کہ تم کو وہ دعا یاد ہے جو میں نے دی تھی۔ حضور نے کہا
جی ہاں! پھر شیخ فرید نے قلم کاغذ اور روشنائی خلافت نامہ لکھنے کے لیے منگوا
اس خلافت نامے کے الفاظ امیر خورد نے دیئے ہیں۔ اس کے پہلے حصے میں
تمہید المہتدی کے پڑھانے کی اجازت ہے۔ دوسرے حصے میں خلافت نامہ
ہے جس میں عربی میں یہ الفاظ ہیں: "نظام الملت والدین محمد ابن احمد کا بزرگ

ہاتھ ہمارے ہاتھ کا نائب ہے اور یہ ہمارے خلفاء میں سے ہیں" خلافت نامے
میں یہ بھی ہے کہ اس کو اسحاق بن علی بن اسحاق متوطن دہلی نے لکھا ہے۔ آخر
میں لکھا ہے کہ فقیر مسعود نے اس کی صحت کی تصدیق کی۔ شیخ فرید کے حکم کے
مطابق آپ اس خلافت نامے کو ہانسی لے گئے تاکہ شیخ جمال الدین سے تصدیق
کرائیں۔ اور اس کے بعد دہلی میں قاضی منتخب سے۔ چونکہ شیخ فرید نے نجیب الدین
متوکل کا نام نہیں لیا، آپ کو شک ہوا کہ شاید شیخ فرید کو ان سے کچھ رنجش ہو گئی
ہے۔ لیکن جب آپ دہلی پہنچے تو معلوم ہوا کہ شیخ نجیب الدین کا ۹ رمضان کو
انتقال ہو چکا تھا۔[1]

شیخ فرید کے پانچ بیٹے تھے۔ اول خواجہ نصیر الدین نصر اللہ جو زراعت
کے طعمۂ حلال سے اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ شیخ قطب الدین کی قبر پر جا کر
ان کے مرید ہوئے، لیکن شیخ فرید نے کہا کہ یہ ارادت کا طریقہ درست نہیں ہے،
مرید کو زندہ پیر کا ہاتھ پکڑنا چاہیے جو اس کی ہدایت کر سکے۔ دوم خواجہ شہاب الدین
جو اپنے باپ کے ساتھ رہتے تھے، شیخ کبیر کو آپ سے خاص محبت تھی۔ سوم، شیخ
بدرالدین سلیمان۔ چہارم خواجہ نظام الدین جو بلبن کی فوج میں نوکر تھے۔ آپ اپنے
والد بزرگوار کے انتقال کے ایک سال بعد چنگیزی منگولوں سے لڑتے ہوئے
شہید ہوئے۔ پنجم، خواجہ یعقوب۔ شیخ فرید نے تین بیٹیاں بھی چھوڑیں۔ بی بی مستورہ
بی بی شریفہ اور بی بی فاطمہ۔ بی بی فاطمہ کا نکاح شیخ بدرالدین اسحاق سے ہوا۔
شیخ فرید کے خاندان کا نسب نامہ اس کتاب کے ضمیمے میں ملے گا۔
شیخ فرید نے اپنے بیٹوں میں سے کسی کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا۔ امیر خورد

---

[1] سیر الاولیاء۔ شیخ نظام الدین۔ نکتۂ ہشتم۔

نے کچھ باتیں لکھی ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ شیخ فرید کی آخری بیماری میں امیر خورد کے دادا، سید محمد کرمانی، دہلی سے اجودھن پہنچے۔ آپ نے دیکھا کہ شیخ فرید حجرے کے اندر ایک کھاٹ پر لیٹے ہیں اور دروازے کے باہر آپ کے بیٹے اور دوست مشورہ کر رہے ہیں کہ کس طرح آپ سے مقام اور سجادہ کے بارے میں درخواست کریں۔ جب سید محمد کرمانی حجرے کے اندر جانے لگے تو شیخ فرید کے بیٹوں نے ان کو روکا، لیکن انھوں نے نہ مانا اور داخل ہو گئے۔ شیخ فرید نے آنکھ کھول کر پوچھا: سید کیسے ہو اور کب آئے؟ سید محمد کرمانی نے پہلے دہلی کے اور لوگوں کا ذکر کیا۔ پھر جب شیخ کبیر کا ذکر آیا تو شیخ فرید نے فرمایا کہ "یہ جامہ، مصلیٰ اور عصا ان کو دیا جائے۔" اس پر شیخ فرید کے فرزند بہت خفا ہوئے کہ تم نے ہماری چیز غیر کو پہنچا دی۔ بہر حال جب حضور اپنے پیر کی قبر کی زیارت کے لیے اجودھن گئے تو مولانا بدرالدین اسحاق نے شیخ فرید کا جامہ، مصلا اور عصا آپ کو دیا اور حضور کو یہ بھی بتایا کہ سید محمد کرمانی نے آپ کی کیا خدمت کی ہے[1]۔

شیخ فرید نے وصال سے پہلے تین دفعہ عشاء کی نماز پڑھی۔ قلعہ اجودھن کی فصیل کے باہر ایک شہداء کا قبرستان ہے، مقام پُر فضا تھا اور شیخ فرید کے خاندان کا خیال تھا کہ آپ کو وہیں دفن کریں۔ آپ اکثر وہاں عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کے محبوب ترین پسر خواجہ نظام الدین سلطان بلبن کی فوج کے ساتھ پٹیالی میں تھے۔ فوج سے چھٹی لے کر آپ اجودھن کے لیے روانہ ہوئے لیکن اس رات کو جب آپ اجودھن پہنچے تو دروازے حصار کے

---

[1] سیر الاولیاء، باب اول۔ شیخ نظام الدین۔ نکتہ ہشتم۔

بند ہو گئے تھے اور آپ کو مجبوراً حصار کے باہر رات گزارنا پڑی۔ صبح کو جب آپ دروازے کے پاس پہنچے تو شیخ فرید کا جنازہ دوسری طرف سے آ رہا تھا۔ آپ نے بھائیوں سے پوچھا کہ کہاں دفن کرو گے۔ انھوں نے کہا حصار کے باہر شہداء کے قبرستان میں۔ خواجہ نظام الدین نے کہا کہ اگر ایسا کرو گے تو تمھاری کوئی عزت نہیں رہے گی۔ جو بھی زیارت کے لیے آئے گا، زیارت کر کے باہر سے چلا جائے گا۔ اس نصیحت کے مطابق نماز جنازہ قلعہ کے باہر پڑھی، پھر جنازے کو واپس لا کر وہاں دفن کیا جہاں آپ کی قبر آج کل ہے۔ ایک کچی اینٹ کا حجرہ تھا، اس کو بدل کر شیخ فرید کا روضۂ متبرکہ تیار کیا[1]

حمید قلندر کو بہت خواہش تھی کہ معلوم کریں کہ وہ نعمت جو شیخ کبیر نے شیخ فرید سے پائی، وہ کیسے ملی۔ جب آپ نے شیخ نصیرالدین محمود سے پوچھا تو جواب ملا کہ اس معاملے میں دو قسم کی روایتیں ہیں۔ ایک جو عوام میں رائج ہے ایک جو میں نے خود شیخ کبیر سے سنی ہے۔ عام روایت یہ ہے کہ شیخ فرید اور شیخ کبیر ایک ہی کشتی میں تھے، باقی لوگ جو کشتی میں تھے وہ سو گئے۔ شیخ فرید نے پکارا ' نظام '۔ شیخ کبیر نے جواب دیا ' لبیک '۔ شیخ فرید نے کہا کہ میں اپنے بیٹے نظام الدین کو بلا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر شیخ فرید نے کہا ' نظام ' اور شیخ فرید نے جواب دیا ' لبیک '۔ شیخ فرید نے کہا ' آؤ، مسعود چاہتا تھا کہ اپنے بیٹے کو ایک نعمت دے، لیکن خدائے تعالیٰ نے وہ تم کو دلائی ہے '۔ یہ کہہ کر آپ نے شیخ کبیر کو وہ نعمت دی۔ (اس روایت میں دو اسقام ہیں۔ اول لشکریوں کو خلافت نہیں دیتے تھے۔ دوسرے سلسلۂ چشتیہ میں یہ رسم اب تک

---

[1] سیرالاولیا، شیخ نظام الدین اولیا، نکتۂ ہشتم۔

رائج نہیں ہوئی تھی کہ باپ بیٹے کو اپنا خلیفہ بنائے)۔

دوسری روایت جو شیخ نصیر الدین نے شیخ کبیر سے سنی تھی، حسب ذیل ہے: ایک دن شیخ بدر الدین اسحاق کو کہیں جانا تھا۔ آپ نے مجھ سے کہا کہ شیخ فرید کے حجرے کے سامنے بیٹھے رہو۔ اگر آپ دستک دیں تو جواب دینا اور اگر کوئی آئے تو آپ کو اطلاع کرنا۔ میں بیٹھ گیا اور یقین کے ساتھ میں نے شیخ فرید کو حجرے کے اندر یہ بیت پڑھتے سنا:

خواہم کہ ہمیشہ در ہوای تو زیم
خاکی شوم و بزیر پای تو زیم
مقصود من بندہ ز کونین توئی
از بہر تو میرم از برای تو زیم

میں نے دل میں کہا، نظام یہ وقت اچھا ہے اندر جا۔ پھر مجھے خوف ہوا کہ بے محل نہ ہو آخر میں نے یہ طے کیا کہ اگر وقت خوش ہے تو مجھے کوئی نعمت ملے گی، اگر نہیں ہے تو آپ بخشش کرنے والوں میں ہیں۔ میں نے یہ خیال کیا اور ایک ہاتھ کواڑ پر مارا اور کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ شیخ وجد کی حالت میں ہیں۔ دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کیے ہوئے قبلہ رخ کھڑے ہیں۔ کبھی آگے جاتے ہیں، پھر پیچھے آتے ہیں، یہ بیت پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں:

مقصود من بندہ ز کونین توئی
از بہر تو میرم از برای تو زیم

شیخ فرید نے مجھے دیکھ کر کہا: 'اچھے وقت آئے ہو، کیا چاہتے ہو، مانگو'، میں نے عرض کیا کہ 'میں استقامت چاہتا ہوں'۔ شیخ فرید نے فرمایا

اچھا ہمیں سنے دی "۔ اسی وقت اس کا اثر میں نے اپنے میں پایا۔ شیخ نصیرالدین نے یہ بھی کہا کہ شیخ کبیر یہ بھی کہتے تھے کہ سالوں مجھے اس کی پریشانی رہی کہ میں سنے یہ درخواست کیوں نہیں کی کہ میری موت سماع میں ہو۔ بندہ (یعنی حمید قلندر) سنے عرض کیا کہ سماع میں کیا مرتبہ اور قربت ہے کہ شیخ کبیر نے اس کی خواہش کی! اس پر شیخ نصیرالدین نے یہ مصرع پڑھا:

"ناچنے کے یہ معنی نہیں ہوتے ہیں کہ ہر وقت اچکو"[1]

---

[1] خیر المجالس: مجلس شصت و ہفتم، ص ۲۲۴ - ۲۲۵۔

چوتھا باب

شیخ کبیر کی جد و جہد اور فتوح

تمام زندگی میں شیخ بزرگ کا ذریعۂ معاش فتوح کے علاوہ اور کچھ نہ رہا۔ آپ نے فتوح کے قواعد بیان کیے ہیں۔ "تھوڑی گفتگو اس بارے میں ہوئی کہ بعض مشائخ چاندی قبول کرتے ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ چاندی لینے اور اس کے خرچ کرنے کے بارے میں کچھ شرائط ہیں: اول لینے والے کو چاہیے کہ جو کچھ لے ایمانداری سے لے۔ مثلاً اگر ایک شخص نے اپنے بالوں کو دو گیسوؤں کی شکل میں رکھا ہے اور دینے والا اس کو علوی اور فرزندانِ رسول میں سے سمجھ کر دیتا ہے، اور وہ علوی نہیں ہے تو لینے والے کے لیے یہ مال حرام ہے۔ پھر گفتگو اس کے بارے میں ہوئی کہ مرد کو نہ زبان سے کچھ مانگنا چاہیے اور نہ دل میں خواہش کرنا چاہیے کہ اگر فلاں شخص مجھے کچھ دے تو اچھا ہوگا۔ اگر بغیر مانگے اور بغیر خواہش کیے کسی آدمی کے پاس کوئی چیز پہنچے تو وہ اس کے لیے جائز ہے۔ پھر آپ نے ایک بزرگ کی حکایت بیان کی جو کہتے تھے، میں کسی سے کچھ نہیں مانگتا ہوں اور نہ دل سے خواہش کرتا ہوں۔ لیکن اگر کوئی مجھے کچھ دے تو میں لے لیتا ہوں، چاہے دینے والا شیطان ہی کیوں نہ ہو۔ حضور نے مکرر فرمایا کہ جو ان بزرگ نے کہا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص مجھے کوئی چیز دے گا...

میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے لایا ہے۔ میری طرف سے خواہش نہ ہونا چاہیے۔ (۲۹ر ذی الحجہ ۷۰۷ھ)"

فتوح کی ایک سخت شرط یہ بھی تھی کہ صوفی اور شیخ توکل پر زندگی بسر کریں۔ جو کچھ اپنی ضروریات سے بچے وہ فوراً غربا پر خرچ کر ڈالیں، آئندہ کے لیے کچھ جمع نہ کریں۔ حضور فرماتے ہیں کہ شیخ فرید جو کچھ آتا تھا خرچ کر ڈالتے تھے یہاں تک کہ جب آپ کی قبر کے لیے کچی اینٹوں کی ضرورت پڑی تو آپ کے گھر کی ایک دیوار توڑ کر ان کو حاصل کرنا پڑا۔ چشتی صوفیوں کا شیخ بہاء الدین زکریا پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ آپ فتوح جمع کر کے ہندوستان کے مالدار شخصوں میں سے ہو گئے۔ اس وقت کے چشتی صوفیوں کے لیے بھیک مانگنا بالکل منع تھا اور کسی حاکم یا مالدار شخص کے پاس جا کر درخواست کرنا کہ میں مردِ خدا ہوں۔ مجھے کچھ دو ایک عذاب عظیم کا مرتکب ہونا تھا۔

لیکن اس کا التزام ناممکن تھا کہ صوفی کو بہ وقت ضرورت فتوح پہنچیں۔ اس لیے زنبیل یا تھیلی کے گھمانے کی اجازت تھی۔ لوگ زنبیل میں جو کچھ ہو سکتا تھا خشک کھانے کی چیزیں ڈال دیتے تھے۔ شیخ نصیر الدین محمود فرماتے ہیں: سالہا سال شیخ فرید الدین کی زنبیل گھمائی گئی ہے۔ شیخ کبیر بارہا کہتے تھے کہ وہ روز جب شیخ فرید کے یہاں میں پیٹ بھر کے ڈیلا یا کریلا کھا سکتا تھا میرے لیے روزِ عید کی طرح ہوتا تھا۔ ڈیلے اور کریلے کی فصل میں شیخ فرید اور ان کے دوست اس کو کھاتے تھے۔ ہمارا ایک یار تھا جو کوشش کر کے ان کو لاتا تھا اور ہم سب کھاتے تھے۔ جب ڈیلے اور کریلے کا وقت نہ ہوتا تو شیخ فرید کی زنبیل گھماتے۔ شیخ کبیر کی زنبیل بھی کبھی کبھی گھمائی گئی ہے۔ اس کے بعد شیخ نصیر الدین نے فرمایا کہ اتنی زحمتیں برداشت کرنے کے بعد (یہ دو بزرگ) اپنے درجے کو

پہنچے ہیں۔[1]

حضور کو اپنے پیر کا اتنا خیال تھا کہ آپ کی زبان سے کبھی ایک لفظ نہیں نکلا جو شیخ فرید کے خاندان کے کسی شخص کو بُرا لگے۔ اسی لیے آپ اپنے اُس زمانے کی زندگی کے بارے میں خاموش ہیں۔

سیر الاولیا سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ جمال الدین ہانسوی کا انتقال شیخ فرید کی زندگی میں ہوگیا تھا۔ ان کے بیٹے برہان الدین صوفی بہت کم سن تھے۔ شیخ فرید نے ان کو خلافت عطا کی لیکن ان کو ہدایت کی کہ شیخ کبیر کی سرپرستی میں اپنی تعلیم ختم کریں۔ شیخ فرید کے انتقال کے بعد اُن کے خاندان نے اُن کے بیٹے شیخ بدر الدین سلیمان کو ان کا سجادہ نشین بنایا۔ شیخ سلیمان کے بچپن میں چشت کی سجادہ نشینی کا جھگڑا ہوا تھا۔ خاندان پرست لوگوں نے خواجہ قطب الدین چشتی کو، جو بہت کم سن تھے، سجادہ پر بٹھایا۔ لیکن ان کی عمر کی وجہ سے کچھ بزرگوں کو خیال ہوا کہ ان کے چچا خواجہ علی چشتی کو سجادہ پر بیٹھنا چاہیے۔ چشت کے دو بزرگ خواجہ زور اور خواجہ غور ہندوستان سے ان کو بلانے کے لیے بھیجے گئے لیکن خواجہ علی چشتی کو سلطان غیاث الدین بلبن کے دربار سے تعلق تھا اور بلبن نے ان کو جانے کی اجازت نہیں دی۔ دہلی کے راستے میں خواجہ زور اور خواجہ غور اجودھن آئے۔ یہاں شیخ فرید نے ان کی بہت آؤ بھگت کی اور آپ کے کہنے سے انھوں نے دو ٹوپیاں شیخ فرید سے لے کر آپ کے دو لڑکوں شیخ شہاب الدین اور شیخ سلیمان کے سر پر خاندانِ چشت کی طرف سے پہنا دیں۔ چونکہ شیخ سلیمان کو شیخ فرید نے اپنا خلیفہ نہیں بنایا تھا، اس لیے

---

[1] خیر المجالس۔ مجلس چہاردہ و چہاردہم۔

شیخ سلیمان اپنے کو چشت کا نامزد سمجھتے تھے اور مشائخ چشت کی طرح بالوں میں دو مانگیں بناتے تھے۔

شیخ بدرالدین اسحاق اس کے لیے تیار تھے کہ جس طرح انھوں نے شیخ فرید کی خدمت کی تھی ویسے ہی شیخ بدرالدین سلیمان کی بھی خدمت کریں۔ لیکن فتنہ گر بیچ میں حائل ہوئے اور دونوں میں پھوٹ ڈال دی۔ شیخ اسحاق نے سید محمد محمود کرمانی (امیر خورد کے دادا) سے صلاح کی اور سید محمود نے کہا کہ اگر صحبت عزت سے نہیں نبھ سکتی تو دوری بہتر ہے (صحبت کہ بہ عزت نبود، دوری بہ) شیخ اسحاق شیخ سلیمان کا گھر چھوڑ کر اجودھن کی جامع مسجد میں آگئے اور وہاں لڑکوں کو قرآن وغیرہ پڑھانا شروع کر دیا۔ امیر خورد نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے لیکن غالباً شیخ اسحاق کی بی بی اور ان کے دو بیٹے، خواجہ محمد اور خواجہ موسیٰ، شیخ بدرالدین سلیمان کے مکان میں رہتے رہے۔ پہلے سید محمد محمود کرمانی اپنے خاندان کے ساتھ دہلی آئے اور شیخ اسحاق کے انتقال کے بعد شیخ کبیر نے سید محمود کو اجودھن بھیجا کہ بی بی فاطمہ اور ان کے دونوں بیٹوں کو دہلی لائیں[1]۔

عماد الملک راوت عرض سلطان بلبن کا مشہور وزیر جنگ تھا۔ اس زمانے میں وزیر جنگ کو عریض ممالک کہتے تھے۔ خواجہ ضیاء الدین برنی نے اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں راوت عرض کا بیان کسی قدر تفصیل سے دیا ہے، لیکن یہ نہیں لکھا ہے کہ ان کا انتقال کس سال ہوا۔ لیکن جب سنہ ۱۲۸۰ء میں طغرل نے بنگال میں بغاوت کی اور بلبن نے بنگال پر چڑھائی کی تو راوت عرض کا کہیں ذکر

---

[1] یہ واقعات سیر الاولیاء میں مختلف جگہ دیئے ہوئے ہیں۔

نہیں آتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ راوت عرض کا اس سے پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ ہمارے مشہور شاعر ابوالحسن خسرو کے والد سیف الدین لاچین کا نکاح راوت عرض کی لڑکی سے ہوا تھا۔ امیر لاچین کے تین بیٹے تھے، اعز الدین علی شاہ، حسام الدین احمد اور ابوالحسن خسرو۔ یہ نہیں معلوم کہ کس سال امیر لاچین اور ان کے بیٹے حضور کے مرید ہوئے۔ لیکن شیخ جمال الدین سیر العارفین میں لکھتے ہیں کہ مرید ہونے کے وقت امیر خسرو کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ دوسرے سال امیر لاچین شہید ہوگئے اور امیر خسرو کی تعلیم کا بار راوت عرض نے اپنے ذمے لیا۔

حضور کے اس زمانے کا حال ہم کو صرف امیر خورد کی سیر الاولیاء سے ملتا ہے اور یہ باتیں انھوں نے اپنے باپ سید مبارک کرمانی سے سنی تھیں۔ کچھ زمانے کے بعد راوت عرض کا مکان خالی ہوگیا چونکہ اس کے بیٹے اپنے انطاع (ضلعوں) پر چلے گئے تھے۔ راوت عرض امیر خسرو کا نانا تھا اور امیر خسرو کے وسیلے سے شیخ کبیر اس مکان میں گئے اور وہاں تقریباً دو سال رہے۔ یہ مکان متصل برج حصارِ دہلی دروازہ منڈہ اوریل کے قریب تھا، یہاں تک کہ برج حصار بھی اس مکان میں داخل ہوگیا تھا۔ اس مکان کی چھتیں اور ستون بہت اونچے تھے۔ سید محمد محمود کرمانی بھی اس مکان میں حضور کی خدمت میں آگئے اس مکان کی تین منزلیں تھیں، نیچے کی منزل میں سید محمد کرمانی اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ بیچ کی منزل میں حضور اور تیسری منزل میں دیگر یار رہتے تھے۔ میرے والد کہتے تھے کہ اس زمانے میں میں بہت کم سن تھا اور میرے اور مبشر کے علاوہ کوئی نوکر نہ تھا۔ افطار کے کھانے کا انتظام میری دادی کرتی تھیں، جو شیخ فرید کی مرید تھیں۔ افطار کا کھانا میرے دادا، جو شیخ کبیر کے ہم خرقہ تھے،

لے جایا کرتے تھے۔ خدمت خاص مثلاً وضو کرانا، جائے ضرور میں ڈھیلے رکھنا وغیرہ، میرے باپ کے ذمّے تھا۔

الغرض اس اثناء میں راوت عرض کے بیٹے اپنے اقطاع سے واپس آئے اور اپنے مراتب ملکی کے زور سے فوراً مکان خالی کرالیا۔ شیخ کبیر کو اتنا وقت نہ دیا کہ دوسرا مکان تلاش کریں۔ حضور نے مجبوراً اس مکان کو خالی کردیا۔ آپ کی کتابیں، جن کے علاوہ آپ کے پاس اور کوئی سامان نہ تھا، میں نے اپنے سر پر رکھیں اور اس چھپر کی مسجد میں لے گیا جو سراج بقال کے مکان کے سامنے تھی۔ حضور نے رات مسجد میں گزاری اور میرے دادا اپنے خاندان کے ساتھ چھپر کی دہلیز میں اتر رہے۔ دوسرے دن سید کاغذی کو، جو شیخ صدر الدین کا مرید تھا، اس واقعہ کی خبر ہوئی۔ وہ آیا اور بہت تعظیم اور اصرار کے ساتھ حضور کو اپنے مکان میں لے گیا۔ اس کے مکان کی چھت پر ایک کمرہ تھا۔ حضور کو اس نے وہاں اتارا اور سید محمد کرمانی کے رہنے کے لیے دوسری جگہ انتظام کیا۔ حضور ایک مہینے کے قریب اس کمرے میں رہے۔ اس کے بعد آپ وہاں سے سرائے رکابدار میں آ گئے۔ یہ سرائے پل قیسہ سے ملی ہوئی تھی۔ سرائے کے بیچ میں ایک مکان تھا۔ آپ نے اس میں سکونت اختیار کی۔ سید محمد کرمانی نے اپنے خاندان کو اس سرائے کے ایک حجرے میں رکھا۔ پھر آپ یہاں سے اٹھ کر شادی گلابی کے مکان میں جو محمد میوہ فروش کی دکانوں کے متصل تھا، رہنے لگے۔ اس درمیان میں شمس الدین شرابدار کے بیٹے اور اقربا، جو آپ کے معتقدین میں سے تھے، آپ کو کمال عزت کے ساتھ شمس الدین شرابدار کے مکان میں لے گئے۔ سالوں تک حضور اس مکان میں رہے اور بہت راحت اور جمعیت حضور کو اس مکان میں حاصل ہوئی۔ بیشتر یار جو اجودھن سے آتے تھے،

حضور کو اس مکان میں پاتے تھے۔[1]

لیکن آپ کو شہر دہلی سے نفرت تھی۔ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ "شہر دہلی میں راحت نہ ہے اور نہ کبھی تھی"۔ پھر اپنی زندگی کے بارے میں آپ نے فرمایا:

"پرانے زمانے میں بھی مجھے شہر میں رہنے کی خواہش نہ تھی۔ ایک روز میں حوض قتلغ خاں پر گیا۔ اس زمانے میں میں قرآن یاد کرتا تھا۔ وہاں میں نے ایک درویش کو دیکھا جو عبادت میں مشغول تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور پوچھا کہ کیا آپ اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں۔ میں نے پھر دریافت کیا کہ آپ یہاں اپنی خواہش سے ہیں۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ پھر اس درویش نے اپنی حکایت بیان کی۔ دروازہ کمال کے باہر خندق کے پاس ایک قبرستان ہے اور دروازہ مذکور کے پاس ایک بلند زمین ہے جس میں شہداء دفن ہیں۔ یہاں میں ایک بزرگ درویش سے ملا جس نے مجھ سے کہا کہ اگر سلامتی ایمان سے مرنا چاہتے ہو تو اس شہر سے باہر جاؤ۔ میں نے فوراً شہر چھوڑنے کا ارادہ کیا لیکن بہت سی چیزوں سے مجبور ہوں۔ اب پچیس سال گزر گئے ہیں، میرا ارادہ اپنی جگہ پر قائم ہے لیکن میں جا نہیں سکتا ہوں"۔

جب میں نے یہ بات درویش سے سنی، میں نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ

---

[1] سیر الاولیاء۔ باب اول۔ شیخ نظام الدین اولیاء۔ ذکر پنجم۔

شرابدار کے یہاں معنی شرابدار سلطان کے ہیں۔ سلطان ناصر الدین محمود اور سلطان بلبن دونوں شراب نہیں پیتے تھے، لیکن عہدے کا نام نہیں بدلا گیا۔ امیر خورد کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شمس الدین شرابدار کا انتقال ہو گیا تھا لیکن خاندان غالباً خوش حال تھا۔

شہر دہلی میں نہیں رہوں گا۔ کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ پٹیالی جاؤں چونکہ ترک (یعنی حضرت امیر خسرو) وہاں ہیں۔ پھر میں نے طے کیا کہ بسالہ جاؤں جو ایک خوشگوار مقام ہے۔ میں بسالہ گیا اور وہاں تین دن رہا، ہر روز ایک مختلف شخص کا مہمان رہتا تھا، لیکن ان تین دنوں میں مجھے کوئی مکان نہ ملا، نہ کرایہ کا، نہ قیمتاً، نہ گروی۔ بسالہ سے واپس آنے پر یہ بات میرے دل میں تھی۔ ایک وقت حوض رانی کی طرف ایک باغ میں گیا جس کو باغ جسرت کہتے تھے۔ وقت خوش گوار تھا۔ میں نے خدائے عزوجل سے دعا کی کہ خدایا مجھے اس شہر کے باہر جانا ہے لیکن میں کوئی مقام اپنی طرف سے اختیار نہیں کرتا، میں وہاں جاؤں گا جہاں تیرا حکم ہو۔ اس وقت آواز 'غیاث پور' میرے دل میں آئی۔ میں نے کبھی غیاث پور کو نہیں دیکھا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اس آواز سننے کے بعد میں اپنے ایک دوست نقیبی نیشاپوری کے پاس گیا۔ اس کے گھر والوں نے مجھ سے کہا کہ وہ غیاث پور گیا ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ وہی غیاث پور ہے۔ الغرض میں غیاث پور آیا۔ اُس زمانے میں غیاث پور چنداں آباد نہ تھا، ایک ویران موضع تھا جہاں بہت کم آبادی تھی۔ میں یہاں آیا اور سکونت کی۔ (۲۷ شعبان ۷۱۵ھ)

امیر خورد حضور کی غیاث پور کی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں: "میں نے اپنے والد سید محمد مبارک کرمانی سے سنا ہے کہ غیاث پور میں شیخ کبیر کی زنبیل گھماتے تھے۔ افطار کے وقت روٹی کے چند ٹکڑے جو اس زنبیل میں ہوتے وہ حضور کی اور آپ کے خادموں کی قوت جسمانی کا ذریعہ تھے۔ میں نے اپنے چچا سید حسین محمد کرمانی کو کہتے سنا ہے کہ ایک شام کو یہ روٹی کے ٹکڑے دسترخوان پر رکھے تھے اور ہم لوگ تیار تھے کہ افطار کریں۔ اتنے میں ایک فقیر آیا اور یہ

سمجھ کر کہ ہم افطار کر چکے ہیں اور یہ چند روٹی کے ٹکڑے باقی رہ گئے ہیں۔ اس نے ان سب ٹکڑوں کو اپنے ہاتھ میں لیا اور غائب ہو گیا۔ حضور نے مسکرا کر فرمایا کہ ابھی ہمارے کام میں بہت خیریت ہے کہ ہم کو فاقے سے رکھتے ہیں۔ یہ واقعہ دو فاقوں کے بعد ہوا۔ میں نے اپنے والد سے سنا ہے کہ اس زمانے میں شیخ کبیر کو عسرت، فقر اور فاقہ کا سامنا کرنا پڑا۔ جو لوگ شیخ فرید کے یہاں سے آتے تھے ان کی زندگی بھی سختی سے گزرتی تھی اور فاقہ کرتے تھے۔"[1]

مجھے تعجب ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کا شیخ کبیر پر اعتقاد اتنا سخت تھا، امیر خورد اور شیخ جمال الدین دونوں ایک ایسے گمنام درویش کے متلاشی ہیں جس کی وجہ سے حضور کو کامیابی ہوئی یعنی فتوح کا دروازہ کھل گیا۔ دونوں نے مختلف قصے بیان کیے ہیں جو غیر مستند ہیں۔ شیخ جنید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تسلیم کیا کہ ہمارے رسول کی سنت صحبت ہے اور عزلت نہیں ہے لیکن انھوں نے صوفیوں کی عزلت کو اس بنا پر جائز رکھا کہ یہ زمانہ وحشت ہے یعنی ظالمانہ بادشاہی حکومت کا زمانہ ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ صرف عبادات کی زندگی ایک خود غرضی کے اصول پر قائم ہے، یعنی آدمی اپنی فلاح چاہتا ہے اور اس کو اپنی جماعت اور ملت سے کوئی تعلق نہیں۔ لوگ اس عرب کی دعا پر ہنستے ہیں جس نے کہا: "یا خدا! محمدؐ پر رحمت کر اور میرے اوپر رحمت کر، اور ہم دونوں کے علاوہ کسی اور پر رحمت نہ کر!" گوشہ نشینی کی عبادت صرف اس خود غرضانہ فلاح

---

[1] سیر الاولیاء۔ باب اول۔ شیخ نظام الدین۔ نکتہ ہفتم۔

کی تلاش ہے۔ چھبیس یا ستائیس سال کے بعد بھی حضور کو یاد تھا کہ ایک نوجوان نے آپ کو راہِ راست پر لاکر شیخ فرید کی تعلیم کی تکمیل کی۔

حضور فرماتے ہیں : جب کیقباد نے کیلوگڑھی میں سکونت اختیار کی، تو اس کے زمانے میں وہ مقام آباد ہوگیا۔ ملوک امرا اور دوسرے لوگوں کے آنے جانے سے مجمع خلق ہونے لگا[له] میں نے خیال کیا کہ یہاں سے بھی مجھے جانا پڑے گا۔ میں اس خیال میں تھا کہ ایک بزرگ کا جو میرے استاد تھے، شہر میں انتقال ہوا۔ میں نے ارادہ کیا کہ کل ان کا سوم ہے، میں ان کی زیارت میں جاؤں گا اور اس کے بعد شہر میں نہیں رہوں گا۔ میں نے یہ عزیمت کرلی تھی کہ ظہر کی نماز کے بعد ایک نوجوان مجھ سے ملنے آیا۔ وہ نوجوان حسین تھا لیکن بہت دُبلا تھا۔ خدا جانے مردانِ غیب سے تھا یا کیا تھا۔ پہلی بات جو اُس نے مجھ سے ملنے پر کہی یہ تھی :

آن روز کہ مہ شدی نمی دانستی
کانگشت نمای عالمی خواہی بود
امروز کہ خلقت دلِ خلقی بربود
درگوشہ نشستنت نمی دارد سود

حضور نے فرمایا کہ جب دوسری باتیں جو اس نے کہی تھیں میں نے کہیں لکھ لی

له کیقباد ۱۲۸۶ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس کے بعد سلطان جلال الدین بھی کیلو گڑھی میں رہنے لگا اور جو عمارتیں کیقباد نے نامکمل چھوڑ دی تھیں، ان کی تکمیل کی۔ شیخ جمال الدین کہتے ہیں کہ غیاث پور اور کیلوگڑھی کے درمیان نیم کروہ یا ایک میل کا فاصلہ تھا۔ اس طرح کیلو گڑھی اور غیاث پور دونوں شہر دہلی میں شامل ہو گئے۔

ہیں۔ القصہ یہ کہنے کے بعد کہ اوّل آدمی کو مشہور نہ ہونا چاہیے اور اگر مشہور ہو گیا ہے تو اس کو ایسا ہونا چاہیے کہ کل رسول علیہ السلام کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ پھر اس نے کہا: یہ کیا قوّت اور کیا حوصلہ ہے کہ خلق سے گوشہ گیر ہو کر خدا کی عبادت میں مشغول ہو۔ یعنی قوّت اور حوصلہ یہ ہونا چاہیے کہ باوجود خلق کے خدا میں مشغول ہو۔ حضور نے فرمایا کہ جب اس نے یہ سخن تمام کیا، میں نے اس کے سامنے کچھ کھانے کو رکھا۔ اس نے نہ کھایا۔ پھر جب میں نے ارادہ کیا کہ یہیں ساکن رہوں گا تو اس نے کچھ کھایا اور چلا گیا۔ میں اس سے پھر نہ ملا۔ (۲۷ شعبان ۷۱۵ھ)

شیخ کبیر کی شہرت آہستہ آہستہ بڑھی۔ کیقباد کے زمانے میں ایک خواجہ سرا، کافور نام، دو تنکہ آپ کے پاس لایا اور کہا کہ سلطان کا حکم ہے کہ بلبن کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے میں ہر جمعہ کے دن آپ کی خدمت میں دو تنکہ پہنچاتا رہوں۔ آپ نے یہ قبول کر لیے۔ لیکن چند دنوں کے بعد جب آپ نے رقص سماع میں دونوں ہاتھ اٹھائے تو آپ کو خیال آیا کہ چونکہ آپ کے لیے دو تنکہ معین ہو گئے ہیں اس لیے آپ کو روحانی آزادی حاصل نہیں ہے۔ اس لیے آپ نے ان دو معینہ ہفتہ وار تنکوں سے انکار کیا۔ اصل فتوح یہ ہے کہ وہ غیر معینہ ہو۔

سلطان معز الدین کیقباد اپنا تمام وقت عیش پرستی میں صرف کرتا تھا۔ تمام امور سلطنت نظام الدین کوتوال کے ہاتھ میں تھے۔ شیخ الاسلام[۱] کا نواسہ، کبیر نام، بار بار نظام الدین کوتوال کے یہاں نوکری حاصل کرنے کی امید میں جاتا تھا۔

---

[۱] غالباً شیخ قطب الدین بختیار کاکی سے مراد ہے۔

نظام الدین نے تنگ آکر کبیر سے کہا کہ تم اس گھر میں مت آنا' لیکن کبیر بار بار جاتا رہا۔ اسی زمانے میں مجھے نظام الدین کو توال نے چھ سونے کے تنکے بھیجے۔ میں نے ان کو قبول نہیں کیا اور واپس کر دیئے۔ نظام الدین کو توال نے یہ چھ سونے کے تنکے کبیر کو دیدیئے۔ خدمت جس کام میں بھی ہو اپنا پھل لاتی ہے۔ (۲۱ رجب ۷۱۴ھ)

اب حضرت امیر خسرو کے بارے میں کچھ کہنا ضروری ہے۔ شیخ کبیر کی روش امیر خسرو سے ایک طرح بالکل علیحدہ تھی۔ آپ کبھی کسی بادشاہ کے دربار میں نہیں گئے اور نہ کسی بڑے خان یا ملک کی حویلی میں قدم رکھا' برخلاف اس کے امیر خسرو کا پیشہ درباداری تھا لیکن پیشے سے زیادہ اس کی کچھ حیثیت نہ تھی۔ آپ کے دل میں کسی ملک یا بادشاہ کی محبت کبھی نہ ہوئی۔ جب آپ کے ایک مربّی کا دور ختم ہو جاتا تھا تو آسمان میں اس کی بجائے دوسرا ستارہ ضرور طلوع ہو جاتا تھا اور آپ اس ستارے کو اپنا مربّی بنا لیتے تھے۔ آپ نے سب سے پہلے بلبن کے بھتیجے اور باربک' ملک علاء الدین کشلی خان (جو عام طور سے ملک چھجو کے نام سے مشہور تھے) کی نوکری کی اور اس کی شان میں ایسے قصیدے کہے کہ ان کو پڑھ کر آج کل شرم آتی ہے:

چرخ راگفتم کہ خورشیدت کجاست؟
آسماں روی ملک چھجو نمود

ملک چھجو کی نوکری چھوڑ کر آپ اور امیر حسن سجزی بلبن کے بڑے لڑکے سلطان محمد (جن کو بعد میں خان شہید کا لقب دیا گیا) کی نوکری میں ملتان گئے۔ خان شہید ایک معمولی منگول (یا مغول) حملے میں شہید ہو گئے۔ امیر خسرو نے ان کی شہادت کے بارے میں ایک بہت پُراثر مرثیہ کہا۔ غالباً ہندوستان کے فارسی ان مسلمانوں

میں کوئی مرثیہ اس قدر مقبول نہیں ہوا ہے جتنا امیر خسرو کا مرثیہ خانِ شہید پر۔ بداؤنی کی منتخب التواریخ میں اس مرثیے سے ایک لمبا اقتباس دیا ہوا ہے۔

شہ درین تدبیر و آگہ نی کہ تقدیرِ خدا
صفحۂ تدبیر را خطِ مثلث درکشید

بلبن کے آخری زمانے میں معلوم نہ تھا کہ آئندہ سلطنت کی کیا تشکیل ہوگی۔ اس لیے آپ نے امیر علی سر جاندار کی نوکری کرلی، جو بعد کو مقطع اودھ مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آپ معز الدین کیقباد کے نوکر ہوگئے اور آخر وقت تک بادشاہی خدمت میں رہے۔ کیقباد کے حکم سے آپ نے ایک مثنوی قران السعدین لکھی جس میں اس کی اپنے باپ بغرا خان، بادشاہِ بنگال سے ملاقات کا ذکر ہے۔ کیقباد اپنی بیجا عیاشیوں کی وجہ سے فالج میں گرفتار ہوکر مرگیا اور نئے بادشاہ جلال الدین خلجی نے امیر خسرو کو مصحف دار کا عہدہ دیا۔ آپ کا اصلی کام چار پانچ یا زیادہ غزلیں لکھنا تھا جو ستر برس کے بادشاہ کی مجلسِ عیش میں پڑھی جائیں۔ امیر خسرو کے دو پرانے مربیوں (ملک چھجو اور امیر علی سر جاندار) نے سلطان جلال الدین خلجی کے خلاف بغاوت کی۔ جلال الدین نے باغیوں کو شکست دی۔ امیر علی سر جاندار کو معاف کردیا اور ملک چھجو کو قید کر کے ملتان بھیج دیا۔ امیر خسرو نے سلطان جلال الدین کی جنگوں پر ایک چھوٹی مثنوی مفتاح الفتوح لکھی۔ اس مثنوی میں امیر خسرو نے اپنے پرانے مربیوں سے کسی قسم کا اظہارِ محبت نہیں کیا ہے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں آپ نے ایک کتاب خزائن الفتوح علاء الدین کی فتوحات پر لکھی جس میں فتوحاتِ دکن کا ذکر زیادہ تفصیل سے ہے۔ اس کے ساتھ آپ نے ارادہ کیا کہ نظامی گنجوی

کی پانچ مثنویوں کے مقابلے میں پانچ مثنویاں تیار کریں، لیکن پانچویں مثنوی سکندر نامہ میں آپ کو اقرار کرنا پڑا کہ نظامی گنجوی کا پلہ بھاری ہے۔

"چون یک فنہ بود شد یگانہ"

علاؤالدین خلجی نے اپنے بیٹے خضر خاں کو اس کے بچپن میں اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔ خضر خاں شیخ نظام الدین کا مرید تھا۔ اس نے امیر خسرو سے درخواست کی کہ آپ اس کے اور دول رانی کے عشق کے بیان میں ایک مثنوی لکھیں اور آپ کو ایک مسودہ بھی دیا جو اس نے تیار کیا تھا۔ امیر خسرو اس مثنوی کو لکھ رہے تھے کہ سلطنت کی شکل بدل گئی۔ اول خضر خاں شیخ نظام الدین کے اخلاق اور مذہبی اصول بالکل بھول گیا۔ دوم، کافور ہزار دیناری نائب ملک نے سلطان کو اپنے بیٹے سے خفا کر کے اس کا حکم لیا کہ خضر خاں کو گوالیر میں قید کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ قصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ جب سلطان مبارک شاہ خلجی تخت پر بیٹھا تو امیر خسرو اس کے دربار کے بھی شاعر ہوئے۔ اس کی شان میں آپ نے مثنوی "نہ سپہر" لکھی ہے۔ لیکن اس میں صرف مبارک شاہ کے دکن کے حملے کا ذکر ہے۔ باقی صفحات ایسی باتوں پر مشتمل ہیں جن کو مبارک شاہ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مبارک شاہ نے اپنے تین بھائیوں کو جو اندھے کر دیے گئے تھے اور گوالیر میں قید تھے، قتل کرنے کا حکم دیا۔ پھر اس کو بھی خسرو خان اور اس کے برادو قبیلے نے قتل کیا۔ خسرو خان دو مہینے تک تخت پر رہا لیکن اس کے زمانے میں امیر خسرو کو دربار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مبارک شاہ کے دورِ سلطنت میں یہ ممکن نہ تھا کہ امیر خسرو اس کے بے بس بھائیوں کے قتل کی حسرت ناک داستان بیان کرتے، لیکن اب آپ نے تین سو اشعار سے زیادہ بڑھا کر دول رانی خضر خان کے قصے کو ختم کر دیا۔ جب غیاث الدین تغلق

بادشاہ ہوا۔ مگر اس کے بعد خسرو پھر درباروں کے شاعر مقرر ہو گئے۔ آپ کی آخری مثنوی تغلق نامہ میں صرف غیاث الدین تغلق اور خسرو خاں کی لڑائی کا ذکر ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ حضرت امیر خسرو کے چار دیوان ہیں اور ایک بہت مشکل کتاب بنام اعجاز خسروی چار جلدوں میں فارسی نثر میں ہے۔

سلطان جلال الدین خلجی کے زمانے میں حضور کی شہرت شاہی دربار تک پہنچ گئی تھی۔ امیر خورد لکھتے ہیں: "اس فاقہ کشی کی حالت میں سلطان جلال الدین نے کچھ فتوح بھیجی مع اس پیغام کے کہ اگر شیخ کبیر راضی ہوں تو میں ان کے خدمت گاروں کے لیے ایک گاؤں مقرر کردوں تاکہ آپ کی فارغ دلی سے خدمت کرسکیں۔ حضور نے گاؤں لینے سے انکار کر دیا لیکن آپ کے خدمت گاروں اور چند مریدوں نے جب یہ سنا تو آپ کی خدمت میں ہجوم کر کے آئے اور کہا کہ حضور کے لیے ممکن ہے کہ بغیر پانی پینے کے زندہ رہیں، لیکن ہمارے لیے یہ ممکن نہیں اور ہمارا حال دشوار ہے۔ حضور نے طے کیا کہ ان خدمت گاروں اور چند یاروں کا جو یہ بات کہہ رہے ہیں مجھے بالکل خیال نہیں، اگر سب مجھ کو چھوڑ کر چلے جائیں تو مجھے کوئی غم نہ ہوگا۔ لیکن چند یاران اعلیٰ میرے ہم خرقہ ہیں" ان کو آزماؤں اور دیکھوں کہ یہ گاؤں کے طلب گار ہیں یا نہیں۔ اس لیے میرے دادا محمد کرمانی اور چند یارانِ اعلیٰ کو بلایا اور گاؤں قبول کرنے کے معاملے میں مشورہ کیا۔ ان بزرگوں نے جواب دیا: مولانا نظام الدین! ہم لوگ کبھی کبھی آپ کے یہاں روٹی کھا لیتے ہیں، اگر آپ نے یہ گاؤں قبول کیا تو ہم آپ کے یہاں کبھی پانی بھی نہ پیئں گے۔" حضور اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میرے مقصود تم لوگ ہو مجھے دوسروں کا خیال نہیں۔ تم نے میرے دل کو بہت خوش کر دیا اور خدا کا شکر ہے کہ دین کے کام میں میری مدد کی۔

دوستوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔[1]

امیر خورد نے یہ بھی لکھا ہے: "میں نے اپنے والد سے یہ بھی سنا ہے کہ سلطان جلال الدین خلجی اپنے عہدِ دولت میں چاہتا تھا کہ شیخ کبیر سے ملے۔ لیکن باوجود اس خواہش کے اس کو اجازت نہ ملی۔ آخر میں اس نے امیر خسرو سے، جو اس کے مصحف دار تھے، خفیہ طور سے یہ طے کیا کہ بغیر اجازت آپ کی خدمت میں آئے۔ امیر خسرو نے یہ مناسب سمجھا کہ اس بات کو اپنے مرشد سے عرض کر دینا چاہیے۔ بادشاہ نے ان سے ایک خفیہ بات کہی تھی، لیکن آپ کو خوف تھا کہ اگر یہ بات آپ نے شیخ کبیر سے چھپائی تو وہ آپ سے رنجیدہ ہو جائیں گے کہ تم کو معلوم تھا، تم نے مجھے کیوں نہیں آگاہ کیا؟ اس لیے امیر خسرو نے اپنی جان پر کھیل کر شیخ کبیر کو اطلاع دی کہ کل بادشاہ آپ سے ملنے آئے گا۔ حضور فوراً اجودھن شیخ فرید کی زیارت کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب بادشاہ نے یہ سُنا تو امیر خسرو سے رنجیدہ ہوا کہ تم نے میرے بھید کو کیوں ظاہر کر دیا اور مجھے سعادتِ پاے بوس سے محروم رکھا۔ امیر خسرو نے جواب دیا کہ بادشاہ کی خفگی سے خوفِ جان ہے لیکن شیخ کی خفگی سے ایمان ضائع ہونے کا خوف ہے۔ بادشاہ مردِ دانا تھا، اس نے اس جواب کی تعریف کی۔"[2]

۱۲۹۹ء میں ایک منگول فوج نے دہلی سلطنت کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ فوج کا رہنما قتلغ خواجہ، بادشاہ ترکستان کا بیٹا تھا۔ چونکہ منگولوں کا ارادہ ملک فتح کرنے کا تھا انھوں نے کہیں لوٹ مار نہ کی اور راستے میں کوئی اتنی مضبوط ہندستانی

۱- سیر الاولیاء، باب اوّل، شیخ نظام الدین اولیاء، نکتۂ ہفتم۔

۲- " " نکتۂ یازدہم۔

فوج نہیں تھی جو اُن کا مقابلہ کرتی۔ آخر کار مغل فوج کیلی میں جو دہلی سے ایک منزل ہے، آکر ٹھہری اور سلطان علاء الدین خلجی اپنی فوج کے ساتھ ان کے مقابلے کو گیا۔ علاء الدین کو یقین تھا کہ اگر کوئی جنگ نہ ہوئی تو منگولوں کو واپس جانا ہوگا کیونکہ ان کے پاس کوئی رسد کا سامان نہیں تھا اور ان کے پیچھے سب ہندستانی قلعہ دار سلطان علاء الدین کے حکم کے مطابق ان کا راستہ روکنے کے لیے تیار تھے۔ پہلے دن علاء الدین کے وزیر جنگ ظفر خاں نے بغیر بادشاہ کے حکم کے داہنے دستے سے منگولوں پر حملہ کر دیا۔ انھوں نے اس کو گھیر کر شہید کر دیا لیکن علاء الدین اپنی جگہ سے نہ ہٹا اور آخر کار منگولوں نے ایک رات کو طے کیا کہ ان کو واپس جانا چاہیے اور صبح تک غائب ہو گئے۔ علاء الدین نے ان کا پیچھا کرنا مناسب نہ سمجھا اور دہلی واپس آیا۔ موقع بہت نازک تھا۔ سلطان علاء الدین نے سپہ آرائی کے سب امور اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے اور اس کے علاوہ کسی اور کو بغیر جنگ کے فتح کی امید نہ تھی۔ خواجہ ضیاء الدین برنی اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتے ہیں کہ تمام خلقت نے منگولوں کے خوف سے بھاگ کر دہلی میں پناہ لی اور دہلی میں کہیں بھی تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔

فوائد الفواد کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کبیر کی شہرت جنگ کیلی کے وقت شیخ فرید کی شہرت تک پہنچ گئی تھی۔ کچھ گفتگو متائخ سے رغبت خلق کی ہوئی۔ حضور نے فرمایا کہ جنگ کیلی کے وقت میں کچھ دنوں کے لیے شہر دہلی میں گیا تھا۔ جمعہ کے روز میں جامع مسجد گیا اور رغبت خلق کی وجہ سے مجھے بہت مزاحمت ہوئی۔ ایک دن میں مسجد سے باہر آیا اور کوچہ کے راستے سے چلا۔ ایک شخص میرے پیچھے آیا اور پوچھنے لگا آپ تنگ آگئے ہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ اس شخص نے کہا کہ میرے خسر شیخ فرید کے مرید

جب شیخ فرید دہلی میں تھے تو وہ جمعہ کی نماز کے لیے قبل از وقت روانہ ہوتے تھے۔ تاکہ خلق کی مزاحمت کم ہو۔ لیکن لوگ بھی قبل از وقت ان کا ہاتھ چومنے کے لیے پہنچ جاتے تھے۔ ان کے چاروں طرف ایک خلق کا حلقہ بن جاتا تھا۔ جب وہ ایک حلقے کے باہر جاتے تھے تو لوگ جمع ہو کر دوسرا حلقہ بنا لیتے تھے۔ اس طرح سے وہ تنگ آجاتے تھے۔ بالآخر میرے خسر نے کہا: یہ نعمتِ خدا ہے آپ کیوں تنگ آرہے ہیں۔ (۱۵ شوال ۷۱۵ھ)

شیخ کبیر اور سلطان علاءالدین خلجی کے تعلقات کے بارے میں خواہ مخواہ قصے گڑھے گئے ہیں اور ان میں دو مصنفین کی تردید ضروری ہے۔

اول خواجہ ضیاءالدین برنی کے دو بیانات تاریخ فیروز شاہی میں ہیں۔ پہلے آپ بیان کرتے ہیں کہ جب ہندوستان کی فوج ارنگل کا محاصرہ کر رہی تھی تو قریب چالیس دن تک بادشاہ کے پاس فوج کی کوئی خبر نہیں آئی۔ علاءالدین نے ملک قرابک کو ایک اور افسر کے ساتھ بھیجا تاکہ معلوم کریں کہ حضور کو روحانی طور سے کیا معلوم ہوا ہے۔ برنی کا بیان ہے کہ حضور نے ایسے الفاظ استعمال کیے جن کی بنیاد پر قرابک نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ فوج خیریت سے ہے اور شیخ نظام الدین بادشاہ کے فتوحات کے دعاگو ہیں۔ واقعہ غلط ہے اور جو الفاظ برنی نے آپ کی طرف سے استعمال کیے ہیں بالکل ناممکن ہیں۔ میر خسرو کی خزائن الفتوح میں صاف طور سے لکھا ہے کہ قرابک اس زمانے میں فوج کے ساتھ ارنگل میں تھے۔ اس لیے یہ واقعہ ناممکن ہے۔ برنی نے تاریخ فیروز شاہی بالکل اپنی ذاتی یادداشت پر لکھی ہے۔ آپ کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔ یہاں تک کہ امیر خسرو کی کتابوں تک آپ کی رسائی نہ تھی۔ خواجہ ضیاءالدین کا خاندان حکمران طبقے سے تھا۔ آپ کے والد برن (بلند شہر) کے حاکم اور آپ کے چچا

دہلی کے کوتوال تھے۔ آپ خود سترہ سال تک سلطان محمد تغلق کے ندیم (یعنی مصاحب) رہے اور آپ کے لیے بالکل ناممکن تھا کہ اُس اصول 'عنا من اللہ' کو سمجھتے جس پر شیخ کبیر کی زندگی اور روحانی تعلیمات کی بنیاد تھی۔ اس لیے خواجہ ضیاء الدین اظہار تعجب کرتے ہیں کہ سلطان علاء الدین نے شیخ کبیر کو اپنے پاس کیوں نہیں بلایا اور خود ان سے ملنے کیوں نہیں آیا۔ جواب صاف ہے۔ حضور سلطان کے بلانے سے ہرگز اس کے دربار میں نہ جاتے۔ اگر وہ خود آتا تو تھوپ کے مرید بڑے اخلاق سے اطلاع کر دیتے کہ یہاں آپ کا آنا مناسب نہیں۔

ہے۔ جہاں تک علاء الدین کی فتوحات کا تعلق ہے اس زمانے کے مورخ جو کچھ چاہیں سمجھیں، لیکن دو بہت مستند کتابیں یعنی فوائد الفواد اور خیر المجالس اس کی شاہد ہیں کہ آپ نے ان فتوحات کی تعریف یا مذمت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔

دوسرا قصہ امیر خورد نے اپنے والد کی سند پر بیان کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ شیخ کے دشمنوں نے علاء الدین کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ حضور کا تمام خلق اللہ پر بڑا اثر ہے اور ممکن ہے کہ آپ سیاسی دنیا میں قدم رکھنا چاہیں۔ اس لیے سلطان علاء الدین نے ایک خط (تذکرہ) حضور کے لیے لکھا اور اپنے بیٹے خضر خاں کو دیا کہ قدم بوسی کے بعد حضور کے ہاتھ میں رکھ دے۔ تذکرے میں درخواست کی گئی تھی کہ بادشاہ کو آپ کے صلاح اور مشورے کی ضرورت ہے۔ شیخ نے تذکرے کو ہاتھ میں لے لیا اور بغیر اس کے پڑھے ہوئے جواب دیا کہ میں ایک درویش آدمی ہوں، جو بادشاہ[1] اور مسلمانوں کا دعا گو ہے اور جس کو

---

[1] دعا گو ے مسلمانان ہوتے میں شک نہیں، لیکن دعا گو ے بادشاہ کہنا آپ پر اتہام ہے۔

سلطنت کے امور سے کوئی تعلق نہیں۔ علاء الدین یہ جواب سن کر خوش ہوگیا اور حضور سے ملنے کی خواہش کی۔ آپ نے کہا اس کی ضرورت نہیں، لیکن جب سلطان نے اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے مکان میں دو دروازے ہیں۔ اگر بادشاہ ایک دروازے سے آئے گا تو میں دوسرے دروازے سے باہر چلا جاؤں گا۔

واقعہ یہ ہے کہ سلطان علاء الدین کے تعلقات شیخ کبیر سے بہت اچھے رہے۔ شیخ کبیر کی طرح سلطان علاء الدین بھی اپنے کو تمام خلق خدا کا خادم سمجھتا تھا لیکن اس کی خدمت سیاسی اور معاشرتی معاملات میں تھی۔ اس کو روحانی معاملات میں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ اس کے ساتھ اس کا خفیہ کارکنوں کا شعبہ بہت منظم تھا اور اپنے خفیہ کارکنوں کے بھیجے ہوئے کاغذات وہ خود پڑھتا تھا۔ اس کو شیخ کبیر کی خانقاہ کے سب معاملات کی اطلاع ہوتی ہوگی، ممکن ہے کہ شیخ کبیر کے مریدوں میں ایک گروہ اس کے خفیہ کارکنوں کا بھی ہو۔ جب ۷۰۳ھ میں ترغی مغل نے دہلی کو گھیرنا شروع کیا تو سلطان نے اپنے افسروں کے ذریعے سے شیخ کبیر کو اطلاع دی کہ غیاث پور سے آپ دہلی آجائیے اور آپ کے لیے دہلی میں انتظام کر دیا۔ علاء الدین کے بڑے بڑے ملک اور خان شیخ کبیر کے مرید تھے لیکن اس مرید ہونے سے ان کو نہ کوئی فائدہ پہنچا اور نہ کبھی نقصان کا خطرہ رہا۔ حضور حکام طبقے کا اپنے جماعت خانے میں آنا پسند نہیں کرتے تھے لیکن ان پر اپنا دروازہ بند بھی نہ کرتے تھے۔ سلطنت دہلی کا سب سے بڑا سلطان اور سب سے بڑے شیخ ہم عصر تھے، لیکن کوئی مستند جملہ نہیں ملتا جو ایک نے دوسرے کے بارے میں استعمال کیا ہو۔ فوائد الفواد میں سلطان علاء الدین خلجی کا نام کہیں نہیں آیا ہے، لیکن شیخ نصیر الدین محمود کی گفتگو سے

معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین کی حضور کے جماعت خانے میں کافی عزت تھی لیکن یہ عزت اس کی معاشرتی اصلاح کی وجہ سے تھی ورنہ صوفیائے کرام کو سامراجیت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

امیر خورد نے اپنے والد کی سند پر لکھا ہے کہ خدا نے شیخ کبیر کو اسی سال کی عمر عطا فرمائی۔ اس میں جوانی اور درمیانی عمر میں آپ نے تیس سال کا سخت مجاہدہ کیا اور ان تیس سال میں آپ کو افلاس اور تنگی معاش کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ بڑھاپے کے تیس سال میں آپ نے اس سے بھی سخت مجاہدہ کیا لیکن اس زمانے میں فتوح کافی آتی تھی اور آپ کے مجاہدے کی بنیاد ان قاعدوں پر تھی جو آپ نے اپنے لیے بنائے تھے[1]

ایک دو فتوح کا حال ملتا ہے۔ شیخ کبیر کو غیاث پور سے کیلو گڑھی کی جامع مسجد میں روزہ رکھ کر پیدل جانا پڑتا تھا۔ آپ کو خیال ہوا کہ بہت آسانی ہوتی اگر میرے پاس کوئی سواری ہوتی۔ دہلی کے ایک بڑے صوفی شیخ ملک یار پراں تھے۔ وہ سلطان بلبن کے ہم عصر تھے اور ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ شیخ ملک یار پراں کے خادم نے خواب دیکھا کہ اس کے شیخ مرحوم اس کو حکم دے رہے ہیں کہ میری ایک گھوڑی کو تم شیخ کبیر کے پاس لے جاؤ۔ جب یہ خادم گھوڑی حضور کے پاس لایا تو آپ نے فرمایا کہ تم کو اپنے مالک کا حکم مل چکا ہے۔ مجھے بھی اپنے پیر کی اجازت لینا ہے۔ رات کو خواب میں آپ کو اجازت مل گئی۔ دوسرے دن جب ملک یار پراں کا خادم گھوڑی لایا تو آپ نے قبول کر لی۔ شیخ نصیر الدین محمود کہتے ہیں کہ اس وقت بھی آپ کو تنگی معاش تھی[2]

---

[1] باب اول۔ شیخ نظام الدین اولیاء۔ نکتہ نہم

[2] خیر المجالس، مجلس سی و ہفتم۔

جب شیخ بدرالدین اسحاق کا انتقال ہوگیا تو شیخ کبیر کا خیال ہوا کہ ان کی بیوہ بی بی فاطمہ اور ان کے دو لڑکوں (یعنی خواجہ محمد جو بعد میں حضور کے پیش امام ہوئے اور ان کے چھوٹے بھائی خواجہ موسیٰ) کو دہلی بلالیں۔ آپ نے سید محمد کرمانی سے صلاح کی اور ان کی رائے بھی یہی تھی۔ اس اثنا میں ایک سوداگر ملتانی جو شیخ کا ہمسایہ تھا کہیں سے سودا لایا تھا۔ اس نے دو سونے کے تنکے حضور کے سامنے پیش کیے۔ آپ نے ایک سونے کا تنکہ سید محمد کرمانی کو ان کے گھر کے خرچ کے لیے دیا اور دوسرا تنکۂ زر بی بی فاطمہ اور ان کے بیٹوں کے لانے کے خرچ کے لیے۔ جب بی بی فاطمہ دہلی آئیں تو لوگوں کو خیال ہوا کہ حضور ان سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ جب سید محمد کرمانی نے آپ کو اس گفتگو کی اطلاع دی تو آپ نے اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور دوسرے دن اجودھن کے لیے روانہ ہوگئے۔ جب آپ واپس آئے تو بی بی فاطمہ کا انتقال ہوچکا تھا۔

اگرچہ اتنی تفصیل سے واقعات نہیں ملتے ہیں جن کی ہم کو ضرورت ہے لیکن اس زمانے کی کتابوں کی بناء پر حضور کے عروج کے تیس سال کا بیان کرنا ممکن ہے۔

آپ کے دو مکان۔ امیر حسن سجزی اور امیر خورد نے کسی ایک جگہ آپ کے

له یہ واقعہ ۱۳۰۵ء یا ۱۳۰۶ء سے پہلے کا نہیں ہوسکتا ہے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے ملتانی سوداگروں کی ایک کمپنی یا کارپوریشن بنائی تھی اور قیمتی کپڑے لانے کا کام ملتانی سوداگروں کے سپرد کیا تھا۔ ان کو سلطنت سے تجارت کے لیے ایک رقم بھی ملتی تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ایک سونے کا تنکہ کتنے چاندی کے تنکوں کے برابر ہوتا تھا۔ سونے کے تنکے عام طور سے رائج نہ تھے۔ ممکن ہے کہ یہ سونے کے تنکے ملتانی تاجروں کو دیئے جاتے ہوں جن کو سلطنت دہلی کے باہر سے سامان لانا پڑتا تھا۔

مکانوں کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن ان کے مختلف بیانات کو ملایا جائے تو کچھ نقشہ ذہن میں آتا ہے۔ ہم کو نہیں معلوم کہ آپ کا غیاث پور کا مکان کس طرح سے بنا، لیکن اس مکان کی خاص عمارت حضور کا جماعت خانہ تھی۔ اس زمانے کے انجینئر لمبی چوڑی چھت نہیں بنا سکتے تھے۔ اگر اس جماعت خانے کا ایسا بڑا کمرہ یا ہال بنانا ہوتا تو چھت کو ستونوں پر تھامتے تھے۔ اس جماعت خانے کی چھت بہت اونچی تھی اور ستونوں پر قائم تھی۔ شیخ کبیر کے مرید اور مہمان سب اسی میں رہتے تھے۔ جماعت خانہ ہمیشہ بھرا رہتا تھا اور ایک دفعہ حضور کو شیخ نصیر الدین محمود سے بھی جگہ نہ ہونے کی معذرت کرنا پڑی۔ اخی سراج کی طرح کچھ مریدوں نے اسی جماعت خانے کے ایک ستون کے پاس اپنی زندگی کا حصہ کاٹ دیا۔ جماعت خانے کے آگے کھلی زمین تھی جس کے چاروں طرف دیوار تھی اور جماعت خانے کے سامنے دہلیز کا کمرہ تھا جس کے دو دروازے تھے، ایک باہر جانے کا اور ایک اندر آنے کا۔ اس دہلیز کے کمرے کے علاوہ کوئی راستہ باہر جانے کا نہ تھا۔ یہ نہیں پتہ چلتا کہ باورچی خانہ اور بیت الخلا کہاں تھے۔ ممکن ہے کہ عمارت کے باہر کچھ کمرے بھی ہوں جہاں جنس وغیرہ رکھنے کا انتظام ہو۔ امیر خورد نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ ایک بزرگ نے جماعت خانے کی دیوار سے ملا کر اپنا کمرہ یا مکان بنایا۔

حضور کے رہنے کا کمرہ جماعت خانے کی چھت پر تھا۔ آپ کے کمرے کے سامنے ایک آنگن تھا۔ آنگن کی مشرقی دیوار اونچی کردی گئی تھی تاکہ آپ کے ملنے والے جو زیادہ تر اشراق اور چاشت کے درمیان آتے تھے، اس کے سائے میں بیٹھ سکیں۔ دوسری طرف کی دیوار نیچی تھی اور آپ دریائے جمنا اور غالباً ایک ہندو مندر کو وہاں سے دیکھ سکتے تھے۔ حضور کے کمرے کے سامنے آنگن

کے دوسری طرف ایک کواڑ تھا جو زینے کو لے جاتا تھا۔ یہ زینہ کافی اونچا اور تکلیف دہ تھا چونکہ اس کے سب قدم برابر نہیں تھے۔ جماعت خانے کی کچی زمین پر ایک برگد کا درخت جم آیا تھا جس کی شاخیں بڑھ کر آپ کے آنگن پر سایہ کرنے لگیں۔ امیر حسن سجزی نے ایک جگہ بیان کیا ہے کہ زینے کے دروازے کا کواڑ ہوا کی وجہ سے کھٹ کھٹ کرنے لگا اور آپ نے اس کو بہت مضبوطی سے پکڑ کر رکھا۔ آپ کے پکے کمرے کے پیچھے ایک لکڑی کا کمرہ بھی تھا۔ یہ نہیں معلوم کہ وضو، بیت الخلا وغیرہ کا چھت پر کیا انتظام تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ دہلی کی گرمی اور برسات میں اوپر کے کمرے کی گرمی ناقابل برداشت ہو جاتی ہوگی لیکن ہماری کتابوں میں پنکھے یا خس کی ٹٹی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ گرمی کی راتوں میں آپ کا پلنگ آنگن میں بچھا دیا جاتا تھا۔ آپ کے دوپہر کے قیلولے کے لیے ایک چھوٹا حجرہ جماعت خانے کے پاس تھا۔

آپ کا دوسرا مکان کیلوگڑھی مسجد کے دروازے کے مقابلے میں تھا۔ یہ مکان بہت مختصر تھا، ایک یا دو کمرے اور کچھ نہانے اور وضو کا انتظام۔ کمروں کے سامنے کچھ کھلی زمین چہار دیواری سے گھری ہوئی اور برسر راہ دہلیز کا کمرہ، جس میں غالباً دو دروازے تھے۔ جمعہ کی صبح کو خواجہ ابوبکر مصلا دار آپ کی جانماز کیلوگڑھی لے جاتے تھے۔ حضور کیلوگڑھی پہنچ کر پہلے جامع مسجد میں عبادت کے لیے جاتے تھے۔ پھر اپنے مکان میں آکر غسل اور وضو کر کے جمعہ کی نماز کے لیے جاتے تھے۔ غالباً آپ افطار کے بعد پھر اپنے جماعت خانے واپس جاتے تھے۔ جمعہ کی نماز کے بعد ایک خلق کا ہجوم آپ سے ملنے آتا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے امیر حسن سجزی کو ہدایت کی کہ وہ اس ہجوم میں نہ آئیں۔

فتوح۔ شیخ نصیر الدین محمود نے کہا ہے کہ فتوح شیخ کبیر کے جماعت خانے

میں جمنا کے پانی کی طرح بہہ کر آتی تھیں، لیکن سائل اور حاجت مند اس قدر زیادہ ہوتے تھے کہ ان کے لیے یہ فتوح بالکل ناکافی تھیں۔ اس سے زیادہ تخمینہ کرنا ناممکن ہے۔[1] آپ کی ذمہ داریاں بھی بہت بڑھ گئی تھیں۔ اور آپ کی فتوح اتنی نہ ہوتی تھیں کہ اپنے خلفاء کے خاندانوں کی مدد کر سکیں۔ امیر خورد نے ان لوگوں کے نام دیئے ہیں جن کے رہن سہن کا بار، کم یا زیادہ، آپ کے اوپر پڑتا تھا۔ شیخ بدر الدین اسحاق کے دو بیٹے، خواجہ محمد اور خواجہ موسیٰ؛ آپ کے دو سگے بھانجے، خواجہ رفیع الدین ہارونی اور خواجہ تقی الدین نوح۔ خواجہ ابوبکر مصلّادار۔ ان کے بھائی مولانا قاسم اور خواجہ ابوبکر کے بیٹے خواجہ عزیز الدین، یہ تینوں آپ کی بہن کی اولاد میں شمار کیے جاتے ہیں۔ شیخ فرید کی اولاد میں سے تین بزرگ، شیخ زادہ عزیز الدین، شیخ زادہ کمال الدین، اور خواجہ عزیز الدین (مولانا نظام الدین کے پوتے) آپ کی نظر کے سامنے جوان ہوئے۔ علاوہ اس کے دو قوال، حسن بہدی اور صامت قوال، بھی آپ کی نوکری میں تھے۔ بڑھاپے میں آپ کے لیے گھوڑے پر چڑھنا ممکن نہ تھا، اس لیے آپ کے ڈولے کے لیے کہار مقرر کرنا پڑا۔ آپ کے دو نوکر خواجہ اقبال اور خواجہ مبشر صوفیوں کی خدمت کر کے ان کو خوش رکھتے تھے۔ خواجہ اقبال غلام تھے۔ کسی نے آپ کو ہدیہ میں دیا۔ آپ نے ان کو آزاد کر دیا لیکن انھوں نے آپ کی خدمت میں رہنا پسند

---

[1] عام طور سے حضور کی فتوحات کو بہت بڑھا کر لکھتے ہیں۔ مثلاً سیر العارفین میں حضور کی فتوحات کے بارے میں یہ مبالغہ آمیز جملہ ہے: "اس زمانے میں (یعنی قطب الدین مبارک شاہ کے دور حکومت میں) دو ہزار تنکے حضور کے مطبخ اور خیرات میں ہر روز خرچ ہوتے تھے۔ بخشش اور انعام معین اور متعلقوں کی تنخواہ اور مجاوروں اور مسافروں کا خرچ اس کے علاوہ تھا۔" (صفحہ ۷۵)

کیا۔ اس کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں جن کا ذکر امیر خورد نے ضمناً کیا ہے۔ دیکھنے میں تو ایک دہلی کے رئیس کی زندگی تھی، لیکن بنیاد ذکرِ خدا اور توکل پر تھی۔ آپ نے کوئی مستقل آمدنی کبھی نہیں قبول کی۔

امیر حسن سجزی ۱۹ ربیع الاول ۷۱۰ھ کی محفل کے بارے میں لکھتے ہیں: "ان دنوں ایک ملک نے کاغذ تملیک (یعنی انتقالِ ملکیت کی دستاویز) دو باغ اور بہت سی زمین اور اس کی زراعت کے آلات و اسباب کی بابت آپ کی خدمت میں مع اپنے اظہار خلوص کے بھیجا تھا۔ حضور نے قبول نہ کیا۔ آپ نے مسکرا کر کہا، کہاں میں اور کہاں باغ زمین اور زراعت! اگر میں یہ دستاویز قبول کروں تو لوگ کہیں گے کہ شیخ باغ میں جا رہا ہے، شیخ زراعت اور زمین کا تماشا دیکھنے جا رہا ہے۔ میری زندگی کے کام کو ان چیزوں سے کیا تعلق؟ پھر آپ نے آنسو بھری آنکھوں سے کہا کہ میرے سلسلے کے خواجگان اور مشائخ نے کبھی ایسی چیزیں قبول نہیں کی ہیں"۔ پھر آپ نے بیان کیا کہ جب سلطان ناصر الدین ملتان کو جاتے ہوئے اجودھن کے پاس سے گزرا تو غیاث الدین بلبن، جو اس زمانے میں الغ خاں تھا، شیخ فرید کی خدمت میں آیا اور کچھ نقد اور چار گاؤں کی مثال شیخ فرید کے سامنے رکھ دی۔ شیخ کے دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ یہ نقد درویشوں کے لیے ہے اور یہ چار گاؤں کی مثالیں شیخ کے نام ہیں۔ شیخ فرید نے کہا کہ یہ نقد مجھے دے دیجئے۔ میں ان کو درویشوں پر یکجا خرچ کروں گا لیکن گاؤں کی مثالوں کو واپس لے جائیے، ان کے بہت طلب گار ہیں، یہ ان کو دیجئے"۔

شیخ کبیر کی روزانہ زندگی۔ حضور نے ایک دفعہ فرمایا کہ مشائخ کی رسم ہے کہ نمازِ اشراق سے پہلے اور نمازِ ظہر کے بعد کوئی ان سے ملنے نہ آئے۔ لیکن

میرا یہ قاعدہ نہیں ہے۔ جس وقت بھی جو چاہے مل سکتا ہے (۲۹ صفر ۱۳ھ)

پھر بھی آپ کے مریدوں کا فرض تھا کہ آپ کے آرام کا لحاظ رکھیں اور امیر خورد نے آپ کی روزانہ زندگی کا حال بیان کیا ہے، جس کا اُردو ترجمہ (بے موقع اشعار اور کرامات کو نکال کر) حسب ذیل ہوتا ہے۔

"حالانکہ عمر شیخ کبیر کی اسی سال کی ہو گی، آپ پانچوں وقت کی نماز کے لیے جماعت خانے کی چھت سے جو بہت اونچی تھی، نیچے نماز باجماعت کے لیے آتے۔ باوجود اس عمر کے آپ برابر روزے رکھتے تھے۔ ایسے دن بہت کم ہوتے تھے کہ آپ روزہ نہ رکھیں۔ انطار کے وقت آپ بہت کم کھاتے تھے ایک روٹی یا آدھی روٹی ترکاری یا تلخ کریلے کے ساتھ یا تھوڑے چاول۔ عزیز دوست مسافر یا جس کی بھی قسمت اچھی ہو اس کے لیے آپ خاص لقمہ یا کھانا بھیج دیتے تھے۔ انطار کے بعد آپ اوپر چلے جاتے تھے اور شہر اور اطراف کے جو لوگ آتے تھے ان کو مغرب اور عشاء کی نماز کے درمیان اوپر بلایا جاتا تھا۔ (حضور کا کھانا اوپر بھیجا جاتا تھا) ہر قسم کا میوہ تر و خشک اور کھانے اور پینے کی لذیذ چیزیں، لیکن کسی کو خیال نہ کرنا چاہیے کہ حضور کو کوئی دنیاوی خوشی اس کھانے میں تھی۔ یہ لذیذ چیزیں ان لوگوں کے لیے تھیں جن کو حضور اوپر طلب کرتے تھے۔ عشاء کی نماز حضور باجماعت نیچے پڑھتے۔ اس کے بعد اوپر جا کر کچھ عبادت کرتے۔ جب آپ آرام کرنے کے لیے اپنی کھاٹ پر بیٹھتے تو آپ کی تسبیح آپ کے ہاتھ میں رکھ دی جاتی۔ اس وقت امیر خسرو کے علاوہ کسی (سن رسیدہ) آدمی کو آپ کے پاس جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ آپ سے ہر قسم کی باتیں کرتے۔ حضور امیر خسرو کو خوش کرنے کے لیے اپنا سر ہلاتے اور بار بار پوچھتے: ترک! کیا خبریں ہیں۔ امیر خسرو موقع پا کر ایک جملہ کی بجائے ایک فصل بیان

کرتے۔ کچھ چھوٹے قرابتی بچوں اور مولا زادوں کو اجازت تھی کہ اس وقت آکر حضور کے پیر چومیں۔"

جب امیر خسرو اور بچے آپ کے پاس سے چلے جاتے تو اقبال خادم آتا۔ چند آفتابے پانی کے رکھ جاتا اور پھر چلا جاتا۔ حضور خود اُٹھتے اور دروازے کی زنجیر بند کر دیتے۔ اس وقت خدا کے علاوہ کوئی آپ کے پاس نہ ہوتا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کس راز و نیاز ذوق و شوق میں آپ کی رات گزرتی تھی۔ اس معنی میں یہ شعر آپ بارہا اپنی زبان پر لاتے:

عشقی کہ ز تو دارم اے شمع چگل
دل داند و من دانم و من دانم و دل

میں نے شیخ کبیر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے یہ شعر دیکھے ہیں:

تنہا منم و شب و چراغی
مونس شدہ تا پگاہ روزم
گاہیش ز آہ سرد بکشم
گاہ از تف سینہ برفروزم

یہ شعر بھی حضور کی زبان سے سنا گیا ہے:

بارے بہ تماشای من و شمع بیا
کز من دکے نماند از وے دودے

خواجہ سالار جہین سے، جن کا ذکر نکتہ مناقب یاران میں ہوگا، روایت کی جاتی ہے کہ حضور کہتے تھے کہ آخر شب ایک شعر عالم غیب سے میرے دل میں آتا ہے اور اس سے میرے دل کو خوشی ہوتی ہے، مثلاً کل رات کو یہ اشعار میرے دل میں آئے:

گر بانیسم زندہ بر دوزیم
دامنی کز فراق چاک شدہ
ور نمانیم عذرِ ما بپذیر
ای بسا آرزو کہ خاک شدہ

جب سحری کا وقت ہوتا تو خادم آتا اور باہر سے کواڑ کو کھٹکھٹاتا سحری کا کھانا ہر قسم کا آپ کے سامنے رکھ دیا جاتا، لیکن آپ بہت کم کھاتے اور باقی کے بارے میں کہتے کہ یہ بچوں کے لیے رکھ لو۔ خواجہ عبدالرحیم، جن کے ذمہ سحری کا لے جانا تھا، روایت کرتے ہیں کہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ حضور کچھ نہ کھاتے۔ میں عرض کرتا کہ حضور افطار کے وقت بہت کم کھاتے ہیں، اگر سحر کے وقت بھی نہ کھائیے گا تو کمزوری بہت بڑھ جائے گی۔ لیکن آپ آب دیدہ ہو کر جواب دیتے کہ اتنے مساکین اور درویش مسجدوں اور دکانوں میں بھوکے اور فاقہ کیے ہوئے پڑے ہیں، یہ کھانا میرے حلق کے نیچے کس طرح جائے۔ کھانا اسی طرح آپ کے سامنے سے اٹھا لیا جاتا۔

جب دن ہوتا تو جس شخص کی نظر آپ کے چہرے پر پڑتی تو سمجھتا کہ کوئی مردِ مست ہے، کیونکہ آپ کی آنکھیں شب بیداری کی وجہ سے ہمیشہ سُرخ رہتی تھیں۔ لیکن باوجود اس مجاہدے کے جو حضور نے اختیار کیا کوئی کمزوری آپ پر نہیں ظاہر ہوئی اور آپ کا جسم اپنی ہیئت سے نہیں بدلا۔ کسی نے نہیں کہا ہے کہ حضور ہر روز چار سو یا پانچ سو نماز کی رکعتیں پڑھتے تھے یا اتنی (ہزار) تسبیحیں پڑھتے تھے۔ لیکن آپ کی تمام عمرِ عزیز جس کا خدا کے علاوہ کسی کو علم نہیں، دلوں کے راحت پہنچانے میں صرف ہوئی، چنانچہ آپ کہتے ہیں کہ مجھے ایک خواب میں ایک کتاب دکھائی گئی جس میں لکھا تھا کہ جہاں تک ہو سکے دلوں کو راحت پہنچا چونکہ

مومن کا دل خدا کے رازوں کی جگہ ہے۔ آپ یہ بھی کہتے تھے کہ قیامت کے دن کسی چیز کی اتنی قدر نہ ہوگی جتنی کہ دل کے راحت پہنچانے کی۔

الغرض جب روز ہوتا تو تمام دن یہ بادشاہ دین مشائخ کبار کی طرح قبلہ رو بیٹھے رہتے، ان کا دل متوجہ بہ خدا گویا کہ خدا ان کو دیکھ رہا ہے۔ سب آنے والوں کے مختلف طبقے، علماء، مشائخ، صدور، بزرگ اور کم مایہ سے ان کے فن میں ان کے مرتبے کے مطابق آپ گفتگو کرتے اور ان کے دل کی حالت دریافت کرتے۔ ظاہر میں آپ ان لوگوں سے مشغول ہوتے، لیکن باطن میں کلیۃً مشغول بہ حق ہوتے۔

آنے والے اور جانے والے چاہے شہر کے ہوں یا باہر کے، آتے اور سعادت پابوس حاصل کرتے۔ کوئی بھی آنے والا محروم نہ جاتا۔ کپڑے، جیتل اور تحفے اور ہدیہ جو آپ کے پاس عالم غیب سے آتے تھے سب ان پر خرچ کیے جاتے تھے۔ جو شخص جب بھی آتا تھا فوراً آپ کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن جب حضور قیلولے میں تھے ایک درویش آیا اور چونکہ کوئی چیز موجود نہ تھی، اخی مبارک[1] نے درویش کو واپس کر دیا۔ حضور نے قیلولے میں شیخ فرید کو دیکھا۔ آپ شیخ فرید کی خدمت کرنا چاہتے تھے لیکن شیخ فرید نے فرمایا، اگر گھر میں کچھ نہیں ہے، تب بھی بہ قدرِ امکان آنے والے سے حسنِ رعایت واجب ہے، یہ کہاں سے جائز ہے کہ خستہ دل کو اسی طرح سے واپس کر دو؟ قیلولے سے جاگنے کے بعد آپ نے اخی سراج سے تفتیش کی اور حال معلوم ہوا۔ آپ ان پر خفا ہوئے اور کہا کہ میں نے شیخ فرید کو خواب میں دیکھا ہے اور وہ مجھ پر عتاب

---

[1] کتابت کی غلطی ہے۔ غالباً مراد آپ کے مشہور مرید اور خلیفہ اخی سراج سے ہے۔ جو آپ کے سلسلے کو بنگال میں لے گئے۔ اس سلسلے کے بہت مشہور صوفی شیخ نور قطب عالم ہیں۔

کی حالت میں تھے۔ اب اگر میں قیلولے میں بھی ہوں تو مجھے خبر کردو۔ اس کے بعد حضور کی عادت ہوگئی کہ قیلولے سے جاگنے کے بعد آپ دو چیزیں دریافت کرتے۔ کیا دن ڈھل گیا ہے؛ کوئی آنے والا میرا منتظر تو نہیں ہے؛

نماز ظہر کے بعد جو لوگ قدم بوسی کے لیے آتے تھے، آپ کے سامنے طلب کیے جاتے اور آپ ان سے محبت اور دل جوئی کی باتیں کرتے اور عبادت اور راہ سلوک سمجھاتے۔ ان بزرگ علماء زاہدوں اور عابدوں میں سے جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ آنکھ اٹھا کر آپ کے روئے مبارک کو دیکھے کیونکہ خدا کی بزرگی آپ کے چہرے سے ٹپکتی تھی۔ جو کچھ بھی حضور کہتے وہ سر نیچا کر کے سنتے اور قبول کر لیتے۔ شیخ شمس الدین یحییٰ کہتے ہیں کہ جب میں حضور کی مجلس میں تھا میری مجال نہیں ہوتی تھی کہ سر اونچا کر کے حضور کے چہرے کو دیکھوں۔ سر نیچا کیے ہوئے جو کچھ فرمان ہوتا سر زمین پر رکھ کر سُن لیتا۔ اگر علمی بحث ہوتی اور کوئی علمی مشکل ہوتی تو آپ خداداد نور باطن (علمِ لدنّی) سے حاضران محفل کو تشفی بخش دیتے۔ آپ کے حسنِ تقریر سے سب متحیر رہ جاتے۔ اور کہتے کہ یہ کتابی علم نہیں ہے، اس کی بنیاد الہامِ ربّانی پر ہے۔ اس وجہ سے شہر کے بزرگ علماء، جو اہلِ تصوف کی عداوت اور بغض کی وجہ سے مشہور تھے اس درگاہ کے بندے ہوگئے اور اپنی بڑائی اور سرداری کو اپنے سر سے دور کر کے اپنا سر اس دروازے پر رکھا۔[1]

شیخ کبیر کی فتوح کے بارے میں امیر خورد اپنے باپ سید محمد مبارک کرمانی کی سند پر لکھتے ہیں: جب عالمِ غیب سے فتوح کا دروازہ کھل گیا اور

---

[1] سیر الاولیاء۔ باب اول۔ شیخ نظام الدین اولیاء۔ نکتۂ نہم

دنیا سب طرف سے آپ کی طرف رجوع کرنے لگی، تو محبت خدا نے آپ کے دل پر اس قدر قابو پا لیا تھا کہ آپ کو کسی چیز کی پروا نہ تھی۔ اقبالِ دنیا سے آپ کو اس قدر نفرت تھی کہ آپ کی آنکھوں میں آنسو رہتے تھے۔ اگر کوئی بڑی فتوح پہنچتی تو آپ کا گریہ بڑھ جاتا۔ آپ کوشش کرتے کہ یہ جلدی ختم ہو جائے اور آپ بار بار اس کے خرچ کر ڈالنے کا حکم بھیجتے۔ جب آپ سن لیتے کہ سب کچھ محتاجوں میں تقسیم ہو گیا ہے تو آپ کے دل کو اطمینان ہوتا۔ ہر جمعہ کو مسجد جانے سے پہلے آپ تمام غلّے کے انبار اس طرح خالی کرا دیتے گویا کہ کسی نے جھاڑو دیدی ہے، اس کے بعد مسجد میں جاتے۔ اگر کوئی شہزادے یا بڑے امراء اپنی فتوح کے ساتھ آپ کی خدمت میں آتے اور ان کے دبدبے سے آنے کی آواز آپ کے کانوں تک پہنچتی تو آپ کے صاف دل سے ایک آہ نکلتی کہ کیوں درویش کا وقت غارت کرنے کے لیے آتے ہیں[1]۔

---

[1] سیر الاولیاء، باب اول۔ شیخ نظام الدین اولیاء۔ نکتۂ دہم۔

پانچواں باب
زندگی کے آخری سال

سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی۔ انسانی فطرت کو دیکھتے ہوئے یہ بالکل ناممکن تھا کہ دہلی کے کچھ علماء یا مشائخ کے گروہ شیخ نظام الدین کے مقابلے میں نہ کھڑے ہوتے۔ لیکن سلطان علاء الدین خلجی کے دورِ حکومت میں گورنمنٹ کی پالیسی اِن کے اختلافات میں بالکل غیر جانب دار تھی۔ قطب الدین مبارک بھی اپنی حکومت کے ابتدائی دو سال میں ایسی غیر جانب داری کی پالیسی پر قائم رہا۔ لیکن دکن سے لوٹتے وقت اس کے خلاف ایک سازش ہوئی۔ اس نے مجرموں اور ان کے خاندانوں کو سزا ئے موت دی۔ پھر اس کا حکم دیا کہ اس کے تین اندھے بھائی خضر خاں، شادی خاں اور شہاب الدین عمر، جو گوالیر کے قلعے میں قید تھے، قتل کو دیے جائیں۔ اس واقعہ کو امیر خسرو نے اپنی دول رانی خضر خاں میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

چونکہ خضر خاں شیخ نظام الدین کا مرید تھا، اس لیے مبارک شاہ نے ضروری سمجھا کہ حضور سے بھی جھگڑا شروع کرے۔ اس میں شک نہیں کہ خضر خاں ایک زمانے میں حضور کا مرید تھا لیکن یہ ارادت صرف رسمی تھی۔ امیر خسرو لکھتے ہیں کہ خضر خاں عیاشی میں پڑا اور حضور کی تعلیمات کو بالکل بھول گیا۔ اس کے ہاتھ میں

نوجوان عورتوں کی زلفیں اس طرح رہتی تھیں جیسے عبادت گزار مسلمانوں کے ہاتھ میں تسبیح۔ شیخ کبیر نے دربار اور حکومت کے معاملات میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں لی۔ دقت یہ تھی کہ ایسے آدمی سے بادشاہ بھی کس طرح جھگڑا کرے [۱]

اول، جب بادشاہ کی بنائی ہوئی جامع مسجد، جس کو مسجد میری کہتے تھے تیار ہوگئی تو اس نے علماء اور مشائخ کو دعوت دی کہ جمعہ کی نماز یہاں پڑھیں۔ شیخ کبیر کیلو گڑھی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے لیے جایا کرتے تھے۔ آپ نے جواب دیا کہ وہ مسجد جو میرے قریب ہے، مجھ پر زیادہ حق رکھتی ہے۔

دوسرے، بادشاہ کو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضور کے یہاں فتوح بہت آتے ہیں اور یہ فتوح زیادہ تر اس کے افسر بھیجتے ہیں۔ اس نے اپنے افسران کو فتوح دینے اور حضور کے یہاں جانے سے منع کیا۔ بادشاہ کی اطلاع غالباً غلط تھی۔ حضور کبھی بڑے افسروں کے فتوح سے خوش نہ ہوتے تھے۔ مثلاً خیر المجالس میں لکھا ہے کہ ملک تبلغہ یغدہ حضور کے پاس سو سونے کے تنکہ لایا لیکن آپ نے ایک تنکہ سے زیادہ قبول نہ کیا۔[۲] حضور کے فتوح زیادہ تر عوام الناس سے آتے تھے۔ اس لیے بادشاہ کے حکم کا کوئی اثر نہ ہوا۔ چونکہ عوام الناس حضور کے ساتھ تھے، انھوں نے غالباً فتوح زیادہ لانا شروع کیا۔ اسی کے ساتھ حضور نے حکم دیا کہ جماعت خانے کے خرچ کو دُگنا کر دو۔

تیسرے، مبارک شاہ بار بار کہتا تھا کہ جو میرے پاس شیخ نظام الدین کا

---

[۱] شیخ جمال الدین نے سیر العارفین میں اس جھگڑے کی سب سے زیادہ تفصیل دی ہے لیکن میں نے وہی واقعات لیے ہیں جن کے لیے ہم عصر اسناد مل سکتے ہیں۔

[۲] خیر المجالس، مجلس ہشتاد و ہشتم (ص ۲۵۰)۔

سر لائے گا اس کو ایک ہزار سونے کے تنکے انعام میں دوں گا۔ دہلی میں بدمعاشوں کی کمی نہ تھی، لیکن کسی کو بھی اس سونے کی خواہش نہ ہوئی۔

چوتھے، شیخ جمال الدین لکھتے ہیں کہ حضور نے امیر حسن سجزی کو شیخ ضیاء الدین رومی کے پاس بھیجا کہ آپ بادشاہ کو سمجھائیے کہ درویشوں سے جھگڑا نہ کرے۔ شیخ جمال الدین لکھتے ہیں کہ شیخ ضیاء الدین رومی کا بادشاہ مرید تھا۔ لیکن شیخ ضیاء الدین رومی اس وقت بہت بیمار تھے اور دو تین دن کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ شیخ ضیاء الدین رومی کے سوئم میں بادشاہ اور شیخ کبیر دونوں ملے۔ روایات کا اختلاف ہے لیکن صحیح روایت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بادشاہ نے حضور کے سلام کا جواب نہ دیا۔

پانچویں، آخری سوال یہ تھا کہ شیخ کبیر کسی قانونی گرفت میں آسکتے تھے یا نہیں۔ مبارک شاہ کے دربار کی ایک رسم یہ تھی کہ دہلی کے تمام ممتاز شہری نئے مہینے کا چاند دیکھ کر بادشاہ کو مبارک باد دینے آئیں۔ دربار کے رسوم بادشاہ ہمیشہ بدلتے رہتے تھے۔ غالباً یہ رسم سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں نہ تھی۔ بادشاہ سے ملنے کا سوال نہ تھا۔ امیر حاجب یا اس کے شعبے کے کوئی افسر رجسٹر پر نام لکھ کر بادشاہ کو اطلاع کر دیتے ہوں گے۔ سب مشائخ اور علماء خود جاتے تھے، لیکن شیخ نظام الدین اپنے خادم اقبال کو اپنی طرف سے بھیج دیا کرتے تھے۔ چار سال تک اس پر مبارک شاہ نے اعتراض نہیں کیا لیکن اب جمادی الاول سنہ ۷۲۰ھ (جون سنہ ۱۳۲۰ء) میں مبارک شاہ کو سمجھایا گیا کہ یہ اس کی توہین ہے کہ شیخ نظام الدین کے بجائے ان کا نوکر ان کی طرف سے دربار میں آئے۔ مورخ ضیاء الدین برنی نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ اس زمانے میں مبارک شاہ کا دماغ بالکل بیکار ہو گیا تھا۔ وہ خسرو خاں کے

عشق میں مبتلا تھا اور خسرو خاں اس کی جان لینا چاہتا تھا۔ بادشاہ کی طبیعت اس قدر ترش ہوگئی اور اس کی زبان اس قدر بے لگام تھی کہ کسی وفادار افسر کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اس کو خسرو خان اور اس کے براؤ[1] قبیلہ کی سازشوں سے آگاہ کرے اس حالت میں مبارک شاہ نے طے کیا کہ اگر آنے والے مہینے کی پہلی تاریخ کو شیخ نظام الدین خود نہ آئے تو وہ ان کو بادشاہی حکم سے بلائے گا۔ شیخ کبیر اپنی والدہ کی قبر پر دعا مانگنے گئے، اس کے علاوہ انھوں نے کچھ نہ کیا۔ جمادی الثانی کی پہلی رات کو خسرو خان اور اس کے براؤ نے مبارک شاہ کو قتل کر کے اس کا سر کٹا جسم محل ہزار ستون کی دوسری منزل سے نیچے پھینک دیا۔

اس معاملے کو زیادہ اہمیت نہ دینا چاہیے۔ اس زمانے کے چشتی مشائخ کا اصول تھا کہ شاہی دربار میں نہ جائیں۔ لیکن اگر بادشاہ اپنے قوت بازو سے ان کو دربار میں آنے پر مجبور کرے تو وہ ذمہ دار نہیں تھے اور ایسے جابرانہ حکم کی اطاعت کرتے۔ حضور کے بزرگ خلفا میں سے اکثر کو سلطان محمد بن تغلق نے اپنے دربار میں آنے پر مجبور کیا، اور چونکہ ان کے لیے اور کوئی راستہ نہ تھا وہ دربار میں گئے آزادی سے باتیں کیں اور واپس آئے۔

خسرو خان براؤ۔ مورخین ہند خسرو خان کو دہلی کے بادشاہوں میں جگہ نہیں دیتے ہیں۔ لیکن امیر خسرو کے تغلق نامے سے صاف ظاہر ہے کہ غیاث الدین تغلق شاہ کے علاوہ سلطان علاء الدین اور مبارک شاہ کے تمام افسران نے اس کی بادشاہت کو قبول کر لیا، یہاں تک کہ تغلق شاہ کا بڑا بیٹا (یعنی سلطان محمد بن تغلق) بھی اس کے نوکروں میں شامل تھا۔ دہلی سلطنت کے ہندو ہو جانے

---

[1] امیر خسرو کے تغلق نامے کے مطابق براؤ ایک قبیلہ تھا جس کا موروثی پیشہ ہندو راجاؤں کی نوکری تھی تاکہ ان کی جان کی حفاظت کرے۔

کا کوئی سوال نہ تھا چونکہ تمام پرانے افسر اپنی جگہ پر قائم رہے۔ کوئی ہندو یا براؤ کسی بڑے عہدے پر نہیں مقرر ہوا۔ لیکن خسرو خان اور اس کے صلاح کار حکومت کے رازوں سے ناواقف تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹھیک دو مہینے میں تغلق شاہ نے خسرو خان کی حکومت کو ختم کر دیا۔ شیخ نظام الدین کو ان معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خسرو خان کے صلاح کاروں کی پالیسی تھی کہ وہ عظیم خزانہ جو علاء الدین خلجی نے برسوں کی کوشش کے بعد جمع کیا تھا، مختلف طبقوں میں تقسیم کر کے عوام کی مدد حاصل کریں۔ نتیجہ، جیسے کہ امیر خسرو لکھتے ہیں، بالکل برعکس ہوا۔ لوگوں نے تنکے لے لیے اور اپنے گھر بیٹھے رہے۔ دہلی کے مشہور مشائخ کو دو یا تین لاکھ تنکے بھیجے گئے۔ کچھ نے لینے سے انکار کیا، اوروں نے تنکے لے لیے لیکن احتیاط سے رکھے تاکہ آئندہ حکومت کو واپس کر سکیں۔ شیخ کبیر کو پانچ لاکھ تنکے بھیجے گئے اور آپ نے ان کو فوراً حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا۔

سلطان غیاث الدین تغلق۔ تخت نشینی کے بعد تغلق شاہ کا پہلا فرض یہ تھا کہ شاہی خزانے کا مال پھر خزانے میں واپس لائے۔ اس میں اس کو کافی سختی کرنا پڑی۔ لیکن وہ کامیاب رہا۔ شیخ کبیر نے شاہی مطالبات کے جواب میں کہا کہ بغیر میرے مانگے ہوئے بیت المال کے تنکے میرے پاس بھیجے گئے میں نے ان کو فقراء کے اوپر خرچ کر دیا۔ اپنے لیے میں نے کچھ نہیں لیا۔ ظاہر ہے کہ اس جواب سے بادشاہ کو تکلیف ہوئی ہوگی۔ بیت المال کا خرچ صرف قوانین کے مطابق جائز ہے۔ لیکن تغلق شاہ سلطان جلال الدین کے زمانے سے سلطنت کی ملازمت میں تھا اور اس کو حضور کے طریقوں سے کافی واقفیت ہوگی۔ اس نے اس معاملے کو نظر انداز کیا۔ علاوہ اس کے تغلق شاہ کی پالیسی علماء اور مشائخ کے جھگڑوں میں ویسی ہی غیر جانبدارانہ تھی جیسے علاء الدین خلجی

کی پالیسی۔

اس بیان کے بارے میں کوئی مستند روایت نہیں ملتی ہے کہ بنگال سے واپس ہوتے وقت تغلق شاہ نے حضور کو پیغام بھیجا کہ ہم دونوں کا دہلی میں رہنا مشکل ہے، اس لیے آپ کسی اور شہر میں چلے جایئے۔ اور حضور نے اس کے جواب میں کہا کہ "ہنوز دہلی دور است"۔ واقعہ یہ ہے کہ حضور اس وقت بہت بیمار تھے، بادشاہ کو اس کی ضرور اطلاع ہوئی ہوگی۔ امیر خسرو بغیر بادشاہ کی اجازت دہلی آئے، لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے حضور کا وصال ہو چکا تھا۔

صرف محضر سماع ایک معاملہ ہے جس کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں ہیں، لیکن اگر امیر خورد کے بیان کو غور سے پڑھا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ تغلق شاہ بالکل غیر جانب دار تھا[۱]۔

آج کل سماع کے جائز یا ممنوع ہونے پر بحث کرنا تضیع اوقات ہے۔ لیکن علماء کا ایک گروہ تھا جو چاہتا تھا کہ صوفیاء کرام کو سماع کی اجازت نہ دی جائے۔ یہ مباحثہ تو قاضی حمید ملتانی کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ تغلق شاہ کے سامنے قاضی جلال الدین لواجی، نائب حاکم مملکت (در شرع) اور شیخ زادہ حسام الدین[۲] فرجام نے جو پروردش یافتۂ شیخ کبیر تھے، اس معاملے کو یوں پیش کیا: شیخ نظام الدین

---

[۱] سیر الاولیاء، باب نہم۔ نکتہ در بیان محضر سماع و بحث ان با حضرت سلطان المشائخ قدس سرہٗ۔

[۲] شیخ زادہ حسام الدین کے بارے میں امیر خورد لکھتے ہیں: "انھوں نے غریبی کی حالت میں سلطان المشائخ کے گھر میں حضور کی مختلف مہربانیوں اور شفقتوں سے پرورش پائی تھی۔ چونکہ ■ مشہور ہونا چاہتے تھے انھوں نے بہت مجاہدے کیے اور تکلیفیں اٹھائیں۔ لیکن چونکہ ان میں شوق و سوزِ عشق نہ تھا، کچھ میسّر نہ ہوا۔ اب اس بہانے سے وہ چاہتا تھا کہ اپنے کو مشہور کرے۔ اس کو سامنے لائے تاکہ محضر کے لیے شور کرے۔

(سیر الاولیاء۔ باب نہم۔ ص ۵۲۷)

آج کل سب سے بزرگ صوفی ہیں، لیکن وہ سماع کو جائز رکھتے ہیں اور ان کی وجہ سے سماع کا بہت رواج ہوگیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ایک محضر ہو، اور بادشاہ دونوں طرف کے دلائل سن کر طے کرے کہ کیا حکم جاری کرنا چاہیے۔ بادشاہ کو یہ بات مناسب معلوم ہوئی اور محضر کا انتظام کیا گیا۔ شیخ نظام الدین کو دعوت دی گئی اور شہر کے مشہور امراء، علماء، اور مشائخ بھی بلائے گئے۔ حضور کے جماعت خانے میں مولانا فخر الدین زرادی، قاضی محی الدین کاشانی، مولانا وجیہ الدین پائلی اور دیگر ذی علم صوفی چاہتے تھے کہ تیار ہو کر مباحثے کے لیے جائیں لیکن حضور جانتے تھے کہ ان کے مخالفین صرف ان پر حملہ کرنا چاہتے تھے اور علمی تبادلۂ خیالات کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ اس لیے آپ نے مباحثے کے لیے کوئی تیاری نہ کی۔ محضر کے وقت مولانا فخر الدین زرادی اور قاضی محی الدین کاشانی بن بلائے آپ کے ساتھ ہولیے۔

صدر محضر تغلق شاہ تھا لیکن قبل اس کے کہ محضر شروع ہو، قاضی جلال الدین لوالجی، نائب حکومت نے حضور کو تنبیہ کرنا شروع کی۔ حضور نے ان کی سب باتیں صبر سے سنیں، لیکن جب قاضی صاحب نے کہا کہ "اگر اس کے بعد تم نے دعوت سماع کی اور سماع سنا تو میں حاکم شرع ہوں، تم کو سزا دوں گا" تو حضور کی زبان سے یہ الفاظ نکلے : "معزول ہو تم اس شغل سے جس کے گھمنڈ پر تم ایسی باتیں کرتے ہو" (تغلق شاہ ایک تجربہ کار افسر تھا۔ قاضی جلال الدین لوالجی کو اس کا حق نہیں تھا کہ قبل از محضر اور بادشاہ کی موجودگی میں اپنی طرف سے کوئی حکم جاری کرے۔ اس لیے امیر خورد کا کہنا غالباً صحیح ہے کہ بادشاہ نے قاضی جلال الدین کو بارہ دن کے بعد موقوف کر دیا۔)

محضر کو حسام الدین نے شروع کیا اور بہت سے اعتراضات حضور کے

سماع سننے پر کیے۔ سب ملوک، امراء، مشائخ وغیرہ جو اس محضر میں تھے حضور کا بیان سننا چاہتے تھے لیکن فریق مخالف کی خواہش تھی کہ حضور کو اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہ ملے۔ حضور نے حسام الدین سے پوچھا کہ "سماع کس کو کہتے ہیں؟" حسام الدین کو ماننا پڑا کہ میں سماع کے معنی نہیں جانتا، لیکن علماء اس کو حرام سمجھتے ہیں؟ پھر حضور نے فرمایا کہ اگر تم نہیں جانتے کہ سماع کیا ہے؟ تو تم سے بحث کرنا بیکار ہے۔ شور و غل بہت تھا اور بادشاہ کو بار بار کہنا پڑا کہ غلبہ مت کرو اور سنو کہ شیخ نظام الدین کیا فرماتے ہیں۔ شہر کے دو عالم، مولانا حمید الدین اور مولانا شہاب الدین ملتانی، موجود تھے، لیکن دونوں خاموش رہے، صرف مولانا حمید الدین نے کہا کہ شیخ نظام الدین کے مخالفین ان کے سماع کا حال غلط بیان کر رہے ہیں۔ میں ان کے سماع میں گیا ہوں اور وہاں صرف بڈھے آدمی، مشائخ اور درویش ہوتے ہیں۔ پھر قاضی کمال الدین نے کہا کہ میں نے کہیں پڑھا ہے: "کہا امام ابو حنیفہ نے کہ سماع سننا حرام ہے اور اس میں رقص کرنا کار بد ہے۔" حضور نے فرمایا کہ سماع کو منع نہیں کیا گیا ہے، لیکن قبل اس کے کہ آپ اپنی تقریر ختم کر سکیں شیخ بہاء الدین زکریا کے نواسے شیخ علم الدین محضر میں تشریف لائے اور بادشاہ نے ان کی رائے پوچھی۔ شیخ علم الدین نے کہا کہ میں نے اس مضمون پر ایک رسالہ بنام مقصدہ لکھا ہے اور اس میں ثابت کیا ہے کہ اگر سماع 'دل' سے سنیں تو مباح ہے اور اگر 'نفس' سے سنیں تو حرام ہے۔ پھر بادشاہ نے دریافت کیا کہ آپ نے بغداد، شام اور روم کا سفر کیا ہے، کیا وہاں کے مشائخ سماع سنتے ہیں؟ شیخ علم الدین نے کہا کہ "تمام (اسلامی) شہروں میں بزرگ اور مشائخ سماع سنتے ہیں اور بعضے دف اور شبانہ کے ساتھ۔ کوئی ان کو منع نہیں کرتا ہے چونکہ سماع ان مشائخ میں جنید اور شبلی کی وراثت ہے۔" بادشاہ

یہ سن کر خاموش ہو گیا۔

قاضی جلال الدین نے کہا کہ بادشاہ کو امتناع سماع کا حکم دینا چاہیے۔ چونکہ یہ امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے۔ شیخ نظام الدین نے کہا کہ میں نہیں چاہتا ہوں کہ بادشاہ اس معاملے میں کوئی حکم جاری کرے۔ بادشاہ نے حضور کی نصیحت قبول کی اور آپ کو بہت عزت اور تعظیم سے دربار سے رخصت کیا۔ (امیر خورد نے یہ واقعات مولانا فخر الدین زرادی کے رسالہ کشف المفتاح من وجوہ السماع سے لیے ہیں)

شیخ رکن الدین ملتانی[1]۔ ہندوستان میں سہروردی سلسلے کے بانی، شیخ بہاء الدین زکریا کا ذکر حضور نے اکثر بہت ادب کے ساتھ کیا ہے۔ چشتی سلسلے کے برخلاف شیخ بہاء الدین زکریا حکومت سے تعاون کرتے تھے اور فتوح جمع کرتے تھے۔ شیخ بہاء الدین کے بیٹے، شیخ صدر الدین عارف نے چند لاکھ تنکے اور جائداد جو اُن کو شرعاً اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی غرباء میں تقسیم کر دی اور حکومت سے بھی عدم تعاون کیا۔ شیخ صدر الدین عارف کے بیٹے، شیخ رکن الدین ملتانی پھر اپنے دادا کی روش پر واپس آ گئے۔ اس لیے ان کا دہلی میں آنا ضروری تھا۔ مبارک شاہ نے ان کے ساتھ ایک خاص رعایت کی۔ اگر کوئی شخص اپنی عرضی شیخ رکن الدین کے ڈولے میں رکھ دیتا تھا تو بادشاہ اس کو خود پڑھ کر اس پر حکم جاری کرتا تھا۔ اگر مبارک شاہ کو امید تھی کہ شیخ رکن الدین کی وجہ سے حضور کا اثر کم ہو جائے گا تو یہ اُمید بر نہ آئی۔ امیر خورد لکھتے ہیں کہ ان دو بزرگوں میں پانچ دفعہ ملاقات ہوئی۔ پہلی بار جب شیخ رکن الدین اس سرائے

---

[1] سیر الاولیاء۔ باب اول۔ شیخ نظام الدین۔ نکتہ دوازدہم

میں آکر ٹھہرے جو حوض علائی کے پاس تھی تو سب سے پہلے بزرگ جو ان سے صبح کو ملنے آئے وہ شیخ نظام الدین تھے۔ دوسری بار دونوں بزرگوں کی ملاقات کیلوکھڑی کی جامع مسجد میں ہوئی۔ تیسری بار شیخ رکن الدین حضور سے ملنے آئے[1]۔ دونوں بزرگوں اور ان کے ساتھیوں نے کھانا کھایا اور شیخ رکن الدین کے سامنے اقبال خادم نے کچھ قیمتی کپڑا اور سونے کے تنکے شیخ کبیر کی طرف سے پیش کیے۔ شیخ رکن الدین نے یہ ہدیہ لینے سے انکار کیا لیکن اپنے چھوٹے بھائی عماد الدین اسمٰعیل سے اشارہ کیا کہ وہ قبول کرلیں۔ اس کے بعد دوبار شیخ رکن الدین حضور کی بیماری میں آپ کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ مبارک شاہ خلجی کی پالیسی کا اثر دونوں بزرگوں کے تعلقات پر بالکل نہیں پڑا۔ لیکن جب درویش اور بادشاہ میں تعاون ہوگا تو ظاہر ہے کہ حکم بادشاہ کے ہاتھ میں رہے گا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے (رحلہ) میں لکھا ہے کہ شیخ رکن الدین کسی مہمان کو اپنے جماعت خانے میں نہیں ٹھہراتے تھے جب تک کہ وہ ملتان کے حاکم کی اجازت نہ حاصل کرلے۔

حضور کے خلفاء[2] حضور کی عمر اب اسی برس سے بہت زیادہ تجاوز کرچکی تھی۔ آپ کے مریدوں، دوستوں اور خادموں نے طے کیا کہ بہتر ہوگا کہ اب حضور

---

[1] سوال یہ ہے کہ یہ ملاقات کہاں ہوئی؟ میر خورد کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

"سلطان المشائخ دران روز در خطیرہ بود۔ در مقام معہودہ بارگاہی بعد بالائی حوض خانہ وصفہ کہ مشہور بہ عمارت خواجہ جہان احمد ایاز است در محلی کہ در یند قت شیخ حسن سر برہنہ عمارت کنانیدہ است"

یہ الفاظ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں لکھے گئے ہیں۔ میں ان کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔

[2] سیر الاولیاء۔ باب چہارم۔

اپنے چیدہ مریدوں کو خلافت نامہ دیں۔ سوال مریدوں میں سے چُننے کا تھا۔ پہلے ایک فہرست جس میں تیئیس ۲۳ نام تھے اور جس کو امیر خسرو نے لکھا تھا آپ کے سامنے پیش کی گئی۔ حضور نے فرمایا کہ یہ نام بہت ہیں۔ دوسری فہرست میں کم نام تھے۔ حضور نے فرمایا کہ مولانا فخرالدین زرّادی خلافت ناموں کا مسودہ تیار کریں۔ پھر اس کو سیّد السادات سید حسین بیاض کریں یعنی صاف طور سے لکھیں اور اس میں یہ بھی ظاہر کریں کہ خلافت نامہ انھوں نے لکھا ہے۔ اس کے بعد حضور کے دستخط تھے ان الفاظ میں: "من الفقیر محمد بن احمد بن علی البداونی البخاری" خلافت ناموں کی تاریخ ۲۰ ر ذی الحجہ ۷۲۴ھ تھی۔ امیر خورد کا اصرار ہے کہ ان خلافت ناموں میں کوئی نقص نہیں ہے۔ حضور کا وصال ۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ کو ہوا۔ آپ صرف چالیس دن بیمار رہے۔ یعنی خلافت ناموں پر دستخط کرنے کے بعد آپ تین مہینے اور ستائیس دن زندہ رہے۔

حضور کے خلفاء کا بیان کرنے کے لیے ایک علیحدہ کتاب چاہیے۔ امیر خورد نے آپؒ کے خلفاء میں سے حسب ذیل نام چنے ہیں لیکن اس کا اعتراف کیا ہے کہ پہلے ان خلفاء کے نام دیے ہیں جن سے ان کو اور ان کے خاندان کو زیادہ واقفیت تھی:

(۱) شیخ شمس الدین یحییٰ
(۲) شیخ نصیر الدین محمود
(۳) شیخ قطب الدین منور
(۴) شیخ حسام الدین ملتانی
(۵) شیخ فخرالدین زرّادی
(۶) شیخ علاء الدین نیلی

(۷) شیخ وجیہ الدین یوسف کلاکھڑی

(۸) مولانا سراج الدین

(۹) مولانا شہاب الدین امام

یہ فہرست مکمل نہیں ہے چونکہ ۷۲۴ھ کے پہلے بھی آپ نے خلافت نامہ دیا ہے لیکن ایک جگہ امیر خورد نے حضور کا ایک قول نقل کیا ہے کہ آپ کے اصلی خلافت نامے صرف چار یا پانچ ہیں، باقی خلافت نامے صرف رسمی ہیں۔

مزید برآں امیر خورد نے حضور کے بیس[2] مریدوں کے نام حسب ذیل دیے ہیں:

(۱) خواجہ ابوبکر منڈہ (۲) قاضی محی الدین کاشانی

(۳) مولانا وجیہ الدین پائلی (۴) مولانا فخر الدین مروزی

(۵) مولانا فصیح الدین (۶) حضرت امیر خسرو

(۷) مولانا جمال الدین (۸) مولانا جلال الدین اودھی

(۹) خواجہ کریم الدین سمرقندی المدعو بہ بیانہ (۱۰) حضرت امیر حسن علاء سجزی

(۱۱) قاضی شرف نیرور (۱۲) مولانا بہاء الدین اودھی

(۱۳) شیخ مبارک گوپامئوی (۱۴) خواجہ موید الدین برنی

(۱۵) خواجہ تاج الدین داوری (۱۶) خواجہ ضیاء الدین برنی

(۱۷) خواجہ موید الدین انصاری (۱۸) خواجہ شمس الدین

(۱۹) مولانا نظام الدین شیرازی (۲۰) خواجہ سالار

پھر ان پر انتیس مریدوں کے ناموں کا اضافہ کیا ہے جن کے بارے میں امیر موصوف کو واقفیت کم تھی۔

آخری بیماری۔ امیر خورد نے نہ حضور کی بیماری کا نام دیا ہے اور نہ

---

[1] سیر الاولیاء۔ باب اول۔ شیخ نظام الدین اولیاء۔ بحکتہ پانزدہم ۔ سیر العارفین، ص۔

علامات کا ذکر کیا ہے جن سے معلوم ہو کہ کیا بیماری تھی، لیکن شیخ جمال الدین نے سیر العارفین میں لکھا ہے کہ آپ کا پیشاب بند ہو گیا تھا۔ یہ ایک بڑھاپے کا مرض ہے جس کے لیے اُس زمانے میں کوئی دوا نہ تھی۔ مثانے کے پاس ایک غدود ہے جس کو انگریزی میں پراسٹیٹ گلینڈ کہتے ہیں۔ بڑھاپے میں یہ غدود بیکار ہو جاتا ہے اور سوجنے لگتا ہے اور اس کے سوجنے سے پیشاب کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ آج کل اگر آپریشن کے ذریعہ سے پراسٹیٹ گلینڈ نکال لیں تو مریض اچھا ہو جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے یہ مرض اُس عمر میں آتا ہے جبکہ مریض کی صحت آپریشن کے بار کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ ایک آلہ ہے جس کو کیتھیر کہتے ہیں اور اس کے استعمال سے وقتی اطمینان ہو جاتا ہے۔

امیر خورد کے بیان کے مطابق حضور پر اس بیماری کا حملہ ایک دن نمازِ جمعہ کے بعد ہوا۔ اس کے بعد آپ چالیس دن، کم و بیش زندہ رہے۔ بیماری کے دور میں آپ نے کھانا اور پینا بالکل چھوڑ دیا۔ ایک دن اخی سراج الدین آپ کی خدمت میں مچھلی کا شوربہ لائے۔ آپ نے حکم دیا کہ اس کو بہتے پانی میں ڈال دو۔ آپ کبھی بے ہوش ہو جاتے تھے، لیکن پھر ہوش آجاتا تھا۔ بیماری میں آپ نے گفتگو بھی بہت کم کر دی۔ ایک دن آپ نے اقبال خادم کو حکم دیا کہ جماعت خانے میں جو کچھ ہے وہ فقراء میں تقسیم کر دو۔ اقبال نے اُس غلّہ کے علاوہ جو درویشوں کے کھانے کے لیے رکھا گیا تھا، سب کچھ تقسیم کر دیا۔ حضور نے حکم دیا کہ اس غلّہ کو کیوں رکھا ہے، اس کو بھی تقسیم کر دو۔ دہلی کے فقراء جمع ہوئے اور وہ غلّہ بھی تقسیم ہو گیا۔ آپ کے مریدوں نے مقبرے بنائے تھے اس امید میں کہ حضور کو ان میں سے کسی میں دفن کیا جائے گا۔ لیکن جب امیر خورد کے نانا، مولانا شمس الدین افغانی

نے آپ سے پوچھا کہ آپ ان مقبروں میں سے کس میں سونا پسند کیجیے گا تو آپ نے جواب دیا کہ مجھے کھلے میدان میں دفن کرنا۔ میں کسی مقبرے میں دفن ہونا نہیں چاہتا۔

امیر خورد کا بیان ہے کہ بیماری کے زمانے میں آپ کی آنکھیں اکثر آنسوؤں سے بھری رہتی تھیں اور آپ کہتے تھے کہ رسولِ خداؐ کی خدمت میں پہنچنے کی مجھے بڑی خواہش ہے۔ آپ کو احساس تھا کہ آپ کی زندگی ختم ہو رہی ہے اور آپ کی زبان پر اکثر یہ الفاظ آتے تھے:

"میرویم و میرویم و میرویم"

آپ کا وصال بروز چہار شنبہ ۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ (۳ اپریل ۱۳۲۵ء) بعد از طلوعِ آفتاب ہوا۔ شیخ رکن الدین ملتانی نے بہ وقت نمازِ ظہر آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی[1]۔ نمازِ جنازہ پڑھانے کے بعد شیخ رکن الدین نے کہا کہ اب مجھے معلوم ہوا کہ مجھے دہلی میں چار سال اس لیے رکھا گیا تھا کہ سلطان المشائخ کی نمازِ جنازہ پڑھانے کا شرف مجھے حاصل ہو۔

حضور کا مقبرہ اور دوسری عمارات۔ حضور کی قبر کے اوپر سلطان محمد بن تغلق نے ایک بہت بڑا گنبد بنایا۔ پھر فیروز شاہ تغلق نے اور عمارتیں بنائیں جن کا ذکر امیر خورد نے، جو ان عمارتوں سے اچھی طرح واقف تھے، بیان کیا ہے۔ فیروز شاہ کی فتوحات میں آپ کے مقبرے کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ گویا وہ عالیشان شاہی مقبروں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اب وہ مقبرہ اور عمارتیں کہاں ہیں؟ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے، لیکن شیخ جمال الدین جو حضور کی زیارت کے لیے بہت بار

---

[1] امیر خورد کہتے ہیں کہ انتقال کے وقت آپ کی عمر نواسی برس کی تھی، لیکن یہ صرف اندازہ معلوم ہوتا ہے۔

گئے ہوں گے۔ لکھتے ہیں: "یہ عالی عمارت جس کے صحن میں شیخ نظام الدین کا مقبرہ ہے، خضر خاں کی بنوائی ہوئی ہے"۔ خضر خاں کا اس موقع پر نام لانا تاریخی واقعات کے خلاف ہے، لیکن شیخ جمال الدین کے الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضور کی قبر ایک پکے صحن میں تھی اور محمد بن تغلق کا گنبد بالکل غائب ہو گیا تھا۔ دہلی پر امیر تیمور کے حملے کے بعد بہت سخت زمانہ گزرا۔ دو مہینے تک دہلی میں مُردہ جسموں کی عفونت کی وجہ سے رہنا بالکل ناممکن تھا۔ اس کے بعد صرف سیری کو آباد کیا جا سکا۔ اس میں شک نہیں کہ حضور کی قبر ہمیشہ ایک مشہور زیارت گاہ رہی ہے، لیکن سید اور لودھی حکومت کے زمانے میں غالباً کوئی مرمت کا انتظام نہ ہو سکا اور ان عمارتوں کے پتھروں کو لوگ اٹھا لے گئے۔ دہلی کے بہت سے محل ہیں، مثلاً ایلتمش کا قصر سفید اور بلبن کا قصر لعل۔ جن کے پتھر بھی اب نہیں مل سکتے ہیں۔

چھٹا باب

مذہبی تعلیمات

مجلس مورخہ ۷ار رمضان ۷۱۳ھ میں امیر حسن سجزی لکھتے ہیں: "گفتگو عدل اور ظلم کے بارے میں تھی۔ حضور نے فرمایا کہ خدا کا معاملہ انسان سے دو قسم کا ہے، اور معاملہ انسانوں کا ایک دوسرے سے تین قسم کا ہے۔ خدا کا معاملہ انسان سے یا عدل ہے یا فضل ہے۔ معاملہ انسانوں کا ایک دوسرے سے یا عدل ہے یا فضل ہے یا ظلم ہے۔ اگر انسان ایک دوسرے پر عدل یا فضل کریں گے تو خدا اُن پر فضل کرے گا، اگر انسان ایک دوسرے پر ظلم کریں گے تو خدا اُن پر عدل کرے گا۔ اور جس شخص پر خدا عدل کرے وہ ماخوذ ہوگا، اگرچہ پیغمبر وقت بھی ہو۔ بندے نے عرض کیا کہ کہا جاتا ہے کہ رسول علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ اگر کل قیامت کے دن خدا مجھے اور میرے بھائی عیسیٰ کو دوزخ میں بھیجے تو اس کا عدل ہوگا۔ حضور نے فرمایا، ہاں تمام عالم خدا کی ملکیت ہے جو اپنی ملکیت میں تصرف کرے وہ ظلم نہیں کرتا ہے۔ ظلم یہ ہے کہ دوسرے کی ملکیت میں تصرف کرے۔"

مجلس مورخہ ۲۳ محرم ۷۲۱ھ میں امیر حسن سجزی لکھتے ہیں: "اس کے بعد حضور نے فرمایا کہ بندے کے ہر فعل کا خالق، چاہے وہ فعل اچھا ہو یا برا، خداوند تعالیٰ

ہے۔ چونکہ ہر چیز جو کہ انسان پر وارد ہوتی ہے، خدا کے حکم سے وارد ہوتی ہے، اس لیے کسی خاص آدمی سے کیوں رنجیدہ ہو؟ پھر اس معنی میں آپ نے یہ حکایت بیان کی۔ ایک وقت شیخ ابو سعید ابوالخیر ایک راستے پر جا رہے تھے۔ پیچھے سے ایک بے وقوف آیا اور ایک مُکّا آپ کی گردن پر مارا۔ جب آپ نے پھر کر دیکھا تو بے وقوف نے کہا کہ آپ میری طرف کیوں دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ نہیں کہتے ہیں کہ ہر اچھی اور بُری بات جو بندے پر گزرتی ہے خدا کے حکم سے گزرتی ہے۔ شیخ نے جواب دیا کہ میرا کہنا صحیح ہے، لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ کس بدبخت کو اس کام کے لیے نامزد کیا ہے۔"

ایک بزرگ شیخ احمد کے بارے میں حضور نے فرمایا ہے: "ایک وقت شیخ فرید کے انتقال کے بعد میں ان کی زیارت کے لیے جا رہا تھا۔ سرستی کے حدود میں میری مولانا احمد سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے مجھ سے کہا کہ شیخ فرید کے روضے پر جا کر میرا سلام پہنچانا اور کہنا کہ میں دنیا نہیں طلب کرتا ہوں، اس کے طلب کرنے والے بہت ہیں، میں عقبیٰ بھی نہیں طلب کرتا ہوں، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مسلمان کی طرح مروں اور نیکوں میں شمار کیا جاؤں" (۱۱ محرم ۷۱۱ھ)

۲۵ ذی الحجہ ۷۰۹ھ: حضور ایک جنازے سے واپس آئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ "سنا ہے کہ مرحوم کے انتقال کے وقت ان کے پاس کوئی نہ تھا، نہ اپنا نہ بیگانہ۔ صرف وہ تھا اور خدائے تعالیٰ۔ یہ بہت سعادت اور بزرگی کی موت ہے! .... پھر مولانا شہاب الدین خطیب ہانسوی کا ذکر ہوا۔ وہ مناجات کرتے تھے کہ یا خدا میں نے تیرے بہت سے احکام پر عمل کیا ہے، میں اُمید کرتا ہوں کہ تو بھی میری ایک دعا قبول کرے گا۔ وہ دعا یہ ہے کہ میری موت کے وقت میرے پاس کوئی نہ ہو، نہ ملک الموت نہ کوئی اور فرشتہ۔ بس میں ہوں اور تو ہو۔

آپ کا انتقال اسی طرح ہوا جیسے کہ آپ چاہتے تھے۔"

چونکہ فوائد الفواد حضور کے تمام خیالات پر حاوی نہیں ہے، اس لیے خیر المجالس سے مدد لینا ضروری ہے۔ شیخ نصیر الدین کے خاص خیالات اس مسئلے پر حسب ذیل ہیں:

(۱) توحید اور معرفت۔ "اگر معرفت کے معنی توحید سمجھتے ہو، تو ممکن ہے کہ خدا کی توحید کو سمجھ سکو۔ لیکن اگر تم معرفت سے خدا کے بھید اور اسرار کا دریافت کرنا سمجھتے ہو تو یہ ناممکن ہے . . . انبیاء اور بعضے مشائخ کو حق توحید ہے، لیکن ان کو خدا کے بھیدوں کی معرفت نہیں ہے۔[1]"

(۲) ترک ماسوی اللہ۔ "ترک ماسوی اللہ ایک بھید ہے انبیاء اور اولیاء کے لیے۔ ترک ماسوی اللہ عوام کے لیے نہیں ہے الا بطریق ندرت۔[2]"

(۳) محبتِ خدا۔ "شیخ نصیر الدین نے اولیاء اللہ کے بارے میں فرمایا کہ 'قولاً، فعلاً اور ارادتاً' پیروی پیغمبر علیہ السلام کی کرنا چاہیے تاکہ محبتِ حق تعالیٰ میسر ہو۔ محبت حق تعالیٰ پیغمبر کی پیروی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ آپ نے یہ قرآن کی آیت پڑھی:

"قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ"

(اے رسول کہو کہ اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو، خدا بھی تم سے محبت کرے گا۔[3])

(۴) جذبۂ الٰہی۔ "پھر آپ نے فرمایا کہ محبت تین طرح کی ہوتی ہے، اوّل

---

[1] مجلس چہارم، صفحہ ۲۴-۲۵

[2] مجلس پنجم، صفحہ ۲۵

[3] مجلس پنجم، صفحہ ۲۷

محبت اسلامی، دوم محبت موہبی جو کسب یا محنت کا نتیجہ ہوتی ہے، تیسرے محبت خاص اور یہ نتیجہ ترکِ ماسویٰ اللہ کا ہے۔ ... محبت خاص کا نتیجہ جذبۂ الٰہی ہے ... پھر آپ نے فرمایا کہ جذبہ من جذبات الرحمٰن اس محبت خاص کا پھل ہے[1]

(۵) جنّت اور دوزخ اور بقائے الٰہی۔ اس کے بعد آپ نے یہ مناسب مثال دی۔ جو خیالات آدمی کو بیداری میں ہوتے ہیں، وہی اس کو خواب میں دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کے سامنے وہی آتا ہے جس کی زندگی میں خواہش تھی اور جس سے اس کا دل مشغول تھا۔ اگر دنیا چاہتا تھا تو اس دنیا کو زیب دے کر اس کی نظر میں لائیں گے۔ اگر آخرت میں بہشت اور اس کے محل اور حوروں کی خواہش تھی تو مرنے کے بعد یہ محل اور حور اس کی نظر میں لائے جائیں گے۔ پھر آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آپ نے کہا کہ اگر کسی نے نہ دنیا کی خواہش کی ہے اور نہ حور اور محلوں کی، لیکن صرف ذاتِ پاکِ خدا سے ملنے کی، تو اس کو حضرت عزّت کا مشاہدہ نصیب ہوگا[2] ... پھر آپ نے یہ دعا پڑھی:

"اللھم نسئلک الجنة و نعوذ بک من النار"

(یا خدا میں تجھ سے جنت کی التجا کرتا ہوں اور دوزخ کی آگ سے پناہ مانگتا ہوں۔)

لیکن آپ نے فرمایا کہ درویش اس دعا کو نہیں پڑھتے ہیں اور خدا سے خدا کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگتے ہیں[3] ... پھر آپ نے یہ حدیث پڑھی[4]: "واعددت لعبادی

---

[1] مجلس پنجم، ص ۲۸ - اس جذبۂ الٰہی کو شعراء نے عشق سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی بحث آگے آئے گی۔
[2] مجلس ہفتم، ص ۴۴۔
[3] مجلس ہفتاد و دوم، ص ۲۳۴
[4] حدیثِ قدسی ہے۔

الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر"

(میں نے تیار کی ہے اپنے نیک بندوں کے لیے ... بہشت جس کو نہ انسان کی آنکھوں نے دیکھا ہے اور نہ انسان کے کانوں نے سنا ہے اور جس کا خیال بھی کسی آدمی کے دل میں نہیں آسکتا[1])

اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جنت اور اسی طرح دوزخ کا تصور بھی آدمی کے لیے ناممکن ہے۔

(۵) "آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کی صورت نہیں بیان کی جا سکتی چونکہ وہ شکل و صورت سے پاک ہے[2]"

(۶) ہر انسان کا تعلق خدائے تعالیٰ سے بلا واسطۂ غیر ہے۔ شیخ نصیر الدین نے مولانا حمید قلندر کو ان آیاتِ قرآنی کے معنی سمجھائے ہیں :

(ا) فاذکرونی اذکرکم (پس میرا ذکر کرو میں تمھارا ذکر کروں گا)

(ب) انا جلیس من ذکرنی (میں اس کے پاس ہوں جو میرا ذکر کرے[3])

(ج) والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (اور جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں، ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے۔)

شیخ نصیر الدین فرماتے ہیں کہ کوشش کرنا شرط ہے اور خدا کی ہدایت اس کی جزا ہے۔ آپ اس پر بھی اصرار کرتے ہیں کہ لفظ 'سبلنا' جمع ہے، واحد نہیں ہے یعنی خدا کے پہنچنے کے لیے صرف ایک راستہ نہیں بلکہ بہت سے راستے ہیں[4]

---

[1] مجلس پنجاہ و ہفتم، ص ۱۹۴

[2] " " " ، ص ۱۹۴

[3] مجلس پانزدہم، ص ۶۷ - ۶۸

[4] مجلس ہشت دہم، ص ۶۹ - ۷۰

(۷) شیخ نصیر الدین نے کوئی منطقی ثبوت خدا کے وجود کا نہیں دیا ہے لیکن اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کے لیے آپ نے یہ شعر پڑھا ہے :

نظر در دیدہا ناقص فساد است
وگرنہ یارِ من از کس نہان نیست[1]

شیخ نظام الدین اور شیخ نصیر الدین نے اصولِ تصوف پر کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔ تصوف کے بارے میں آپ سے پہلے بہت کتابیں لکھی گئی تھیں اور آپ کے بعد بھی لکھی گئی ہیں۔ لیکن فوائد الفواد اور خیر المجالس کو غور سے پڑھنے سے آپ کے اعتقادات اور اخلاقی تعلیمات کا ایک مجمل بیان ممکن ہے۔

صوفیائے کرام کے دو طبقے بتائے گئے ہیں، اصحابِ سکر اور اصحابِ صحو۔ اصحاب سکر وہ صوفی ہیں جو اپنے جذبے میں آکر ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن سے عوام، بلکہ تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی وحشت ہوتی ہے۔ اصحاب صحو وہ ہیں جو اپنی زبان اور ذہن پر ہمیشہ قابو رکھتے ہیں۔ ہمارے دونوں بزرگ اصحاب صحو میں سے تھے۔ حضور نظام الدین نے ہمیشہ اصحاب سکر کے مقالات پر، جن کو تصوف کی اصطلاح میں شطحیات کہتے ہیں، بحث کرنے سے انکار کیا ہے۔

آپ سے پہلے شیخ محی الدین ابن عربی نے وحدۃ الوجود کا نظریہ اہلِ علم کے سامنے پیش کیا تھا۔ ابن عربی غالباً اسلام کے سب سے بڑے مفکر ہیں۔ لیکن آپ کا کلام بہت ادق اور مشکل ہے۔ اسی کے ساتھ آپ کی عادت ہو گئی تھی کہ ایسے الفاظ اور جملے استعمال کریں جن سے پڑھنے والے کے دل کو گھبراہٹ ہو[2]۔ خوش قسمتی سے

---

[1] مجلس دوازدہم، ص ۵۹

[2] مثلاً آپ نے کہا ہے : رائیت اللّٰہ علی صورۃ الفرس (میں نے خدا کو گھوڑے کی شکل میں دیکھا)۔ گھوڑے کے یہاں معنی تصورِ عام کے ہیں، لیکن اس قسم کی اصطلاح سے صرف غلط فہمی ہوتی ہے۔

مولانا روم نے اپنی مثنوی شریف میں آپ کے خیالات کو اس خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے کہ تمام اسلامی عالم نے ان کو قبول کر لیا۔ مثنوی شریف کے شعر خیرالمجالس میں ملتے ہیں، لیکن فوائدالفواد میں مثنوی شریف کا کوئی شعر نہیں ہے۔ یہ شیخ ابن عربی کے مخالفین نے وحدۃ الوجود کے مقابلے میں وحدۃ الشہود کا نظریہ پیش کیا ہے۔

وحدۃ الشہود، یعنی انسانی خیالات کی وحدانیت، موجودہ سائنس اور اس کے تجربوں کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن اس کو تصوف سے کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے مسئلے پر فوائدالفواد اور خیرالمجالس خاموش ہیں۔ اسی طرح منصور حلاج کے نظریۂ انا الحق کو بھی آپ نے قابلِ بحث نہیں سمجھا ہے۔

اب حضور کا تصورِ خدا کا یہ ہے کہ وہ تمام عالم کا مالک ہے اس معنی میں جو قرآن میں آئے ہیں: وہ تمام عالم کا مالک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ دوسرے، ہمارے عالم میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں، چاہے عالمِ جمادات ہو یا عالمِ نباتات ہو یا عالمِ حیوانات، ان کا اصلی فاعل (یا مسبب الاسباب) خدا کی مشیت ہے۔ اس مشیت کی بنیاد، جہاں تک کہ آدمی کی عقل کام کر سکتی ہے، قوانینِ فطرت پر ہے۔ ہم کو ان قوانین کی عادت ہو جاتی ہے، اس لیے اگر ان قوانین کے خلاف کوئی بات ہو تو ہم اس کو خرقِ عادت (یعنی قانون کا توڑا جانا) سمجھتے ہیں۔ یہ حضور کے تصوف کی بنیاد ہے۔ لیکن ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ حضور نے ہمیشہ شطحیات سے گریز کیا ہے اور اشارات سے کام لیا ہے۔ اگر موجودہ اصطلاحات استعمال کریں تو کہنا پڑے گا کہ آپ کا فلسفۂ تصوف ارتقائی ہے اور انقلابی نہیں ہے۔

اسلام میں بہت سے خیالات ہیں جو پرانے مذاہب سے [illegible] ہیں۔

اسی طرح بہت سی باتیں ہیں جن کی بنیاد انسانی بے بسی پر ہے۔ آپ نے ان باتوں کو منع نہیں کیا ہے لیکن اشارۃً بتلایا ہے کہ ان کی کیا حیثیت ہے۔ یہاں صرف چند مثالیں بیان کی جا سکتی ہیں لیکن ان کا اطلاق بہت وسیع پیمانے پر کیا جا سکتا ہے۔

دعا۔ حضور نے دعا مانگنے کے طریقے تفصیل سے سمجھائے ہیں۔ دعا کے وقت خدا کی رحمت کا خیال کرنا چاہیے اور اپنے گناہوں کا خیال نہ کرنا چاہیے۔ دعا آفت آنے سے پہلے کرنا چاہیے تاکہ آفت نہ آئے۔ آفت آنے کے بعد بھی دعا کرنا چاہیے تاکہ آفت کم ہو جائے۔ لیکن اس سب سمجھانے کے بعد آپ فرماتے ہیں: "دعا صرف تسکین دل ہے، خدائے عز و جل جانتا ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔" (۷، ذیقعدہ سنہ ۱۲؁ھ)

تعویذ۔ اور مشائخ کی طرح حضور بھی تعویذ لکھتے تھے۔ آپ کو شیخ فرید سے تعویذ لکھنے کی خاص اجازت ملی تھی۔ لیکن آپ کو تعویذ کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ مجلس مورخہ ۱۱ شعبان سنہ ۱۷؁ھ میں آپ فرماتے ہیں: "شیخ فرید نے ایک وقت شیخ قطب الدین بختیار سے عرض کیا کہ لوگ مجھ سے تعویذ طلب کرتے ہیں۔ آپ کا کیا حکم ہے؟ لکھوں اور دوں۔ شیخ قطب الدین نے جواب دیا کہ معاملے کا طے کرنا نہ تیرے ہاتھ میں ہے نہ میرے ہاتھ میں۔ تعویذ میں خدا کا نام اور کلام ہوتا ہے۔ لکھ اور دے۔"

مردانِ غیب۔ قرآن میں جنوں کے وجود کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن ان کی ماہیئت نہیں بتلائی ہے۔ حضور کے زمانے میں جنوں کے بجائے "مردانِ غیب" کا ذکر کرتے تھے۔ حضور نے بھی مردانِ غیب کے چند قصے بیان کیے ہیں۔ لیکن مجلس مورخہ ۷، ربیع الاول سنہ ۱۴؁ھ میں آپ فرماتے ہیں: "اوائل زندگی

میں مجھے مردانِ غیب سے میل جول کی خواہش کبھی ہوتی تھی۔ پھر میں نے اندیشہ کیا کہ کیسی بیجا خواہش ہے، مجھے کسی بہتر روش پر چلنا چاہیے۔"

معراج۔ کچھ گفتگو معراج کے بارے میں ہوئی۔ ایک صاحب جو حاضر تھے انھوں نے دریافت کیا کہ معراج کس نوعیت کی تھی۔ حضور نے فرمایا کہ مکّہ سے بیت المقدس تک 'اسرا' تھا، بیت المقدس سے فلک اول تک معراج تھی۔ اور فلک اول سے مقام قاب قوسین تک 'اعراج' تھا۔ پھر ان صاحب نے اس سوال کو بڑھایا اور کہا کہ کہتے ہیں کہ جسم کو بھی معراج ہوئی تھی اور روح کو بھی۔ یہ دونوں کس طرح ممکن ہیں؟ حضور نے ایک عربی مصرع پڑھا:

'فظن الخیر ولا تسئل عن الخبر'

یعنی گمان نیک رکھو اور تحقیق حال کے بارے میں نہ دریافت کرو۔ پھر حضور نے فرمایا کہ ان باتوں پر ایمان رکھنا چاہیے، لیکن ان کی تحقیق و تفتیش میں کوشش نہ کرنا چاہیے۔ (۲۱ ذیقعد ۷۱۸ھ) مسلمانوں میں معراج کی ہیئت پر بہت بحث ہوئی ہے اور اس بحث میں کوشش کی گئی ہے کہ اس کو لفظی بحث سے طے کر دیا جائے۔ حضور کا کہنا درست ہے کہ یہ ایک بے معنی بحث ہے۔

عشق ذات خدا۔ محبت خدا ایک اصطلاح ہے جس کو قرآن اور تمام آسمانی کتابوں نے استعمال کیا ہے۔ شیخ نصیر الدین نے فرمایا ہے کہ 'محبت خدا' کا آخری درجہ جذبۂ الٰہی ہے۔ اگر آدمی خدا کی اطاعت کرتا ہے تو اس کے تین وجوہ ہو سکتے ہیں: خوف (اس دنیا میں یا دوزخ کا) یا اجرت (یعنی امیدِ جنّت) یا محبّت خدا بغیر کسی اجرت یا خوف کے خیال کے۔ اصلی اخلاق کی بنیاد صرف محبت خدا پر ہو سکتی ہے۔

جھگڑا لفظ "عشق" پر ہے۔ امیر خورد لکھتے ہیں کہ حضور نے فرمایا ہے کہ

لفظ عشق عشقہ سے نکلا ہے اور عشقہ ایک قسم کی خونخوار بیل ہے جس کی جڑیں بہت مضبوط ہوتی ہیں اور جو بہت بڑے درختوں پر چڑھ کر ان کو سکھلا کر مار ڈالتی ہے۔[۱]

فارسی شاعری کا بڑا دور محمود غزنوی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے لیکن محمود کے ہمعصروں میں کوئی صوفی شاعر نہ تھا۔ عام خیال یہ ہے کہ فارسی شاعری میں تصوف کی بنیاد حکیم سنائی نے ڈالی ہے۔ اس کے بعد عطار، نظامی، مولانا روم اور ایک کثیر شعراء کے گروہ نے عشقِ ایزدی پر اشعار لکھنا شروع کیے۔ حضور کے زمانے میں تمام صوفیوں نے عشقِ باری تعالیٰ کو اپنی اصطلاح میں قبول کر لیا تھا، لیکن علماء کی عام جماعت اس کے خلاف تھی۔

فوائد الفواد کے مندرجہ ذیل اقتباسات قابلِ غور ہیں:

"گفتگو عشق اور عقل کے بارے میں شروع ہوئی۔ حضور نے فرمایا کہ اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ علماء اہلِ عقل ہیں اور درویش اہلِ عشق ہیں۔ علماء کی عقل ان کے عشق پر غالب ہوتی ہے اور درویشوں کا عشق ان کی عقل پر۔ انبیاء میں دونوں حال ہیں (یعنی ان کا توازن ہے)۔ ۔ ۔ اسی سلسلے میں حضور نے ملتان کے ایک بزرگ علی کھوکھری کا ذکر کیا۔ وہ کسی کے بارے میں اعتقاد نہ کرتے تھے جس میں عشق اور درد نہ ہو، چاہے اُس کا زہد اور عبادت کسی درجے کی بھی ہو۔ آپ کہتے تھے کہ فلاں میں عشق بالکل نہیں ہے۔ اسی معنی میں حضور نے کہا کہ یحییٰ معاذ رازی کا قول ہے کہ ایک ذرہ محبت کا تمام آدمیوں اور پریوں کی عبادت سے بہتر ہے۔ اسی معنی کے مناسب آپ نے فرمایا کہ شیخ فرید بارہا ہر شخص کے بارے میں کہتے تھے کہ خدا عزّ و جلّ

[۱] سیر الاولیاء۔ ترجمہ مولانا غلام احمد بریاں، ص ۴۶۳

تجھے درد دے۔ لوگ حیران ہوتے تھے کہ یہ کیا دعا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ اس دعا کے کیا معنی تھے۔ (۱۱ر صفر ۷۱۵ھ)

"بعد اس کے حضور نے فرمایا کہ بحریوں کا بھی قاضی حمید الدین ناگوری سے جھگڑا تھا۔ جب مولانا شرف الدین بحری بیمار ہوئے تو اس اخلاق کے مطابق جو درویشوں میں ہمیشہ پایا جاتا ہے، قاضی حمید الدین مولانا شرف الدین کی عیادت کے لیے ان کے دروازے پر گئے۔ مولانا شرف الدین کو خبر کی گئی کہ قاضی حمید الدین آئے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ شخص جو خدا کو معشوق کہتا ہے آیا ہے۔ میں اس کی صورت نہ دیکھوں گا۔ القصہ قاضی حمید الدین کو ان کے پاس نہ جانے دیا۔ بندہ نے عرض کیا کہ معشوق سے مراد محبوب ہے۔ حضور نے جواب دیا کہ اس میں بہت بحثیں ہیں۔ لوگ اپنی عقل سے مطابق جواب دیتے ہیں۔ (۱۱ر شوال ۷۲۰ھ)

حاضرانِ مجلس میں سے ایک نے سوال کیا کہ ایک طرف خدا کی بے حد عظمت اور پاکی اور دوسری طرف فرزند آدم کا اتنا ادنیٰ مقام: یہاں محبت اور قربت کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ حضور نے فرمایا کہ آدمی کی زبان میں اس کا بیان کرنا مشکل ہے اور یہ مسئلہ قابل بحث نہیں ہے۔ پھر بندہ نے ذیل کے شعر کا پہلا مصرع پڑھا اور حضور نے اس کا دوسرا مصرع:

عشق را بو حنیفہ درس نہ کرد

شافعی را درو روایت نیست (۲۷ر رمضان ۷۱۷ھ)

سنت نکاح۔ تقریباً ہر مذہب میں یہ سکھایا گیا ہے کہ مرد اور عورت کو قانونی اور مذہبی نکاح کر کے نوعِ انسان کی تعداد بڑھانا چاہیے۔ صرف چند مذہبوں میں مجرد رہنے کی پابندی مذہبی رہنماؤں پر کی گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب

اس کا خوف ہو سکتا تھا کہ انسانوں کی تعداد ان کاموں کے لیے کافی نہ ہوگی جو ان کو در پیش ہیں، لیکن وہ زمانہ گزر گیا۔ اب اس کا خوف ہے کہ انسانوں کی تعداد اتنی بڑھ جائے گی کہ ان کے لیے ہمارا کرۂ زمین کافی غذا نہ پیدا کر سکے گا۔ حضور نے مجرّد زندگی بسر کی اور آپ کے چند خلفاء نے بھی یہی پسند کیا۔

مجلس مورخہ ۱۱ ربجادی ۷۱۶ھ میں حضور اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"اس درمیان میں حاضرین مجلس میں سے ایک نے حضور کے مرید محمد گوالیری کا پیغام پہنچایا۔ آپ نے فرمایا کہ میں ان کو جانتا ہوں۔ وہ مرد عزیز ہیں۔ ایک وقت انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ مجرّد رہنا بہتر ہے یا متاہل ہونا؟ میں نے جواب دیا کہ عزیمت تجرّد کی ہے اور اجازت تاہل کی ہے۔ اگر کوئی شخص خدا میں اتنا مشغول ہو کہ یہ احوال (یعنی خواہش نفسانی) اس کے دل میں کبھی نہ گزریں اور وہ نہ جانے کہ ان کے معنی کیا ہیں تو بیشک اس کی آنکھیں، زبان اور اعضاء محفوظ رہیں گے اور اس کو مجرد رہنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص خدا میں اس طرح سے مشغول نہیں رہ سکتا ہے اور اس کے دل میں نفسانی خواہشات آتی ہیں تو اس کو متاہل ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہ اصول صرف اعلیٰ طبقے کے صوفیوں کے لیے ہو سکتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ حضور نے اصولِ نکاح پر بحیثیت سنتِ نبوی کوئی اعتراض کیا ہے۔

خرقِ عادت۔ سب سے بڑا مسئلہ حضور کے سامنے خرقِ عادت یا قانونِ فطرت کے [illegible] جانے کا تھا [illegible] بہت خوبی سے حل کیا ہے۔ مجلس مورخہ [illegible] لکھتے ہیں: گفتگو جادو کے بعد معجزہ اور کرامت کے بارے میں ہوئی۔ حضور نے

فرمایا کہ خرق عادت کے چار مرتبے ہیں، معجزہ، کرامت، معونت اور استدراج۔ معجزہ کا سرچشمہ انبیاء ہیں۔ انبیاء علم اور عمل میں کامل ہوتے ہیں اور ان پر خدا سے وحی بھی آتی ہے۔ وہ خرق عادت جس کو انبیاء ظاہر کریں معجزہ ہے۔ کرامت وہ خرق عادت ہے جس کو اولیاء ظاہر کرتے ہیں۔ اولیاء کا بھی علم اور عمل کامل ہوتا ہے، فرق یہ ہے کہ اولیاء مغلوب (یعنی تابع پیغمبر) ہوتے ہیں۔ خرق عادت جو اولیاء سے ظہور میں آئے وہ کرامت ہے۔ معونت بعضے پاگلوں اور مجنونوں سے ہوتی ہے جن میں نہ علم ہے نہ عمل۔ وہ خرق عادت جو کبھی کبھی ان سے ظہور میں آئے اس کو معونت کہتے ہیں۔ استدراج اس طائفہ سے ظہور میں آتا ہے جن میں ایمان بالکل نہیں ہوتا جیسے جادوگر وغیرہ۔ خرق عادت جو ان کی بدولت نظر آئے، اس کو استدراج کہتے ہیں[1]۔"

اس بیان میں حضور نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا ہے، خرق عادت اسلامی مباحث میں ایک مقبول اصطلاح تھی اور آپ نے اسی کو سمجھایا ہے[2]۔ ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جنھوں نے ایک ایسی اصطلاح کا تصور کیا جس کے مطابق نبی اور ولی، جو مذہب کے حامی ہیں، اور پاگل لوگ جن میں مذہب نہیں ہوتا اور ساحر اور دیگر گناہ گار جو مذہب کے مخالف ہیں، ہر چار فرقے قانون فطرت کو توڑ کر خرق عادت کا اظہار کر سکتے ہیں اور ان خوارق میں کوئی ظاہری فرق

---

[1] میں نے ترجمے کو صاف اور واضح کرنے کے لیے لفظ "خرق عادت" چار یا پانچ جگہ استعمال کیا ہے۔ حضور نے اس اصطلاح کو صرف ایک جگہ استعمال کیا ہے۔

[2] مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کی نفحات الانس کے شروع میں اس اصطلاح پر بحث کی گئی ہے۔

نہیں بتایا گیا ہے۔ بہر حال ہم کو یہاں منطقی جھگڑا نہیں کرنا ہے۔ حضور فرما چکے ہیں کہ معجزے پر اعتقاد ضروری ہے۔ لیکن اس پر کوئی تفتیش ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق نبیوں اور رسولوں کا دور ختم ہو گیا ہے، اس لیے اب کسی نئے معجزے کا سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ حضور کے زمانے میں جادوگروں پر عام اعتقاد تھا، لیکن آپ نے اس خرق عادت کو جو پاگل اور ساحر ظاہر کرتے ہیں، قابل بحث نہیں سمجھا ہے۔ اصلی دقت کرامت کے بارے میں تھی۔ ایک عام مطالبہ تھا کہ اہلِ تصوف اظہارِ کرامت سے وہ مقصد پورے کر دیں جہاں انسانی عقل کام نہیں کرتی۔ اس مطالبے کو پورا کرنا ناممکن تھا۔ شیخ نظام الدین اور شیخ نصیر الدین نے کسی کرامت کا دعویٰ نہیں کیا ہے امیر خورد لکھتے ہیں کہ شیخ نظام الدین کے ایک خلیفہ مولانا حسام الدین ملتانی نے عرض کیا: "حضور! خلق مجھ سے کرامت طلب کرتی ہے۔" آپ نے جواب دیا" الکرامۃ ہو الاستقامۃ علیٰ باب الغیب (یعنی دروازۂ خداوندی پر استقامت کرنا ہی کرامت ہے) تم اپنے کام میں ثابت قدم اور مستقیم رہو، کرامت کے طالب نہ بنو[1]۔" شیخ نصیر الدین کے بارے میں حمید قلندر اپنی کتاب خیر المجالس کے اختتام پر لکھتے ہیں: "آپ نے اپنے نفس کو اس سختی سے توڑا ہے کہ اگر آپ کو میں شیخ لکھتا ہوں تو خوش نہیں ہوتے ہیں اور اگر آپ کی کرامت کا ذکر کرتا ہوں تو مجھ سے رنجیدہ ہو جاتے ہیں[2]۔"

اس میں شک نہیں کہ حضور نے بہت سی کرامتوں کا ذکر کیا ہے جو

---

[1] سیر الاولیاء۔ ترجمہ مولانا غلام احمد بریاں، صفحہ ۲۶۳

[2] خیر المجالس، صفحہ ۲۸۹

فوائد الفواد میں قلم بند کی گئی ہیں۔ اس کے بعد ایک پُر لطف حکایت ہے۔ آپ نے کرامت کو بالکل بے معنی قرار دیا ہے۔

پہلے آپ کے چند مقولوں پر غور کرنا ضروری ہے: (۱) ہر معاملہ جو عقل سے طے ہو سکتا ہے، وہ ایک قسم کا ہے۔ جہاں عقل کی گنجایش نہ ہو، وہ معاملہ کرامت کا ہے (۱۳ رمضان ۷۰۸ھ)۔ (۲) اس کے بعد حضور نے فرمایا کہ مرد کے لیے کشف و کرامت حجاب راہ ہیں۔ استقامت محبت الٰہی سے ہوتی ہے (۲۰ شوال ۷۰۸ھ)۔ (۳) گفتگو اس گروہ کے بارے میں ہوئی جو کرامت کا دعویٰ کرتے ہیں اور خود کو کشف و کرامت سے مشہور کرتے ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ یہ ایک بے معنی بات ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: 'خدا نے اولیاء پر کرامت کا پوشیدہ رکھنا فرض کیا ہے، اسی طرح جیسے خدا نے انبیا پر معجزہ کا اظہار کرنا فرض کیا ہے۔ پس اگر کسی نے کرامت کا اظہار کیا تو اس نے ایک حکم فرض کو توڑا۔ ایسا کام کیوں کرے! پھر آپ نے فرمایا کہ سلوک کے سو مرتبے ہیں۔ اور ان میں سترھواں درجہ کشف و کرامت کا ہے۔ اگر سالک اسی مرتبے پر رہ جائے تو باقی تراسی مرتبے کس طرح سے طے کرے گا۔" (۱۲ صفر ۷۱۴ھ)۔ (۴) کچھ گفتگو اس بارے میں ہوئی کہ کرامت کا اظہار نہ کرنا چاہیے حضور نے فرمایا کہ کرامت پیدا کرنا کوئی خاص بات نہیں ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ راستی کی راہ سے فقیر اور بیچارہ بن کر رہے۔[1] (۱۰ ذیقعد ۷۱۶ھ)

جس حکایت کا اوپر اشارہ کیا گیا وہ حسب ذیل ہے۔ مجلس مورخہ ۲۹ ذی الحجہ ۷۱۱ھ میں امیر حسن سجزی لکھتے ہیں: "کچھ گفتگو کشف و کرامت اولیا میں

---

[1] اُردو کا ترجمہ درست معنی نہیں ادا کرتا ہے۔ فارسی جملہ حسب ذیل ہے: "مسلمان از ردی راستی گدای بیچارہ می باید بود۔"

ہوئی۔ حضور نے شیخ سعد الدین حمویہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ پیر بزرگ تھے لیکن بادشاہ شہر ان پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔ ایک دن بادشاہ ان کی خانقاہ کے سامنے سے گزرا۔ بادشاہ نے اپنے حاجب کو اندر بھیجا اور کہا کہ اس صوفی بچہ کو باہر لاؤ تاکہ میں اس کو دیکھوں۔ حاجب اندر گیا اور بادشاہ کا پیغام پہنچایا۔ شیخ نے حاجب کے پیغام پر کچھ دھیان نہ دیا اور اپنی نماز میں مشغول ہو گئے۔ حاجب باہر آیا اور حال بیان کیا۔ بادشاہ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور وہ خود شیخ کی خدمت میں آیا۔ جب شیخ نے بادشاہ کو اندر آتے دیکھا تو وہ بھی کھڑے ہو گئے اور دونوں بشاشت سے ایک جگہ بیٹھ گئے۔ خانقاہ کے نزدیک ایک باغیچہ تھا، شیخ نے اشارہ کیا کہ تھوڑے سے سیب وہاں سے لائے جائیں جب سیب آ گئے تو شیخ ان کو کاٹ کر بادشاہ کو دینے لگے اور بادشاہ نے ان کو کھانا شروع کیا۔"

ایک بڑا سیب اس طبق میں تھا۔ بادشاہ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ اگر ان شیخ میں کرامت اور صفائی ہے تو اس بڑے سیب کو اٹھا کر مجھے دیں گے۔ جیسے ہی یہ خیال بادشاہ کے دل میں گزرا، شیخ نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس سیب کو اٹھا لیا اور پھر بادشاہ سے مخاطب ہو کر اپنا حسب ذیل تجربہ بیان کیا۔

ایک زمانے میں سفر کرتے ہوئے میں ایک شہر میں پہنچا۔ شہر کے دروازے پر میں نے ایک جماعت دیکھی۔ ایک بازیگر تماشا دکھلا رہا تھا۔ بازیگر کے پاس ایک گدھا تھا جس کی آنکھیں کپڑے سے بند کر دی گئی تھیں۔ بازیگر کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی۔ یہ انگوٹھی اس نے تماشا دیکھنے والوں میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں دے دی۔ پھر اس نے تماشا دیکھنے والوں کی طرف منہ کر کے

کہا کہ یہ گدھا دریافت کرلے گا کہ انگوٹھی کس کے پاس ہے۔ گدھے کی آنکھیں بندھی ہوئی تھیں لیکن اس نے تماشا دیکھنے والوں کے دائرے میں گھومنا شروع کیا اور ہر شخص کو سونگھتا جاتا تھا۔ جب گدھا اس مرد کے سامنے پہنچا جس کے پاس انگوٹھی تھی تو کھڑا ہوگیا اور آگے نہ بڑھا۔ بازیگر آیا اور انگوٹھی اس آدمی سے لے لی۔"

اس تقریر کے بعد شیخ سعد الدین حمویہ نے بادشاہ سے کہا کہ اگر ایک آدمی کشف وکرامت دکھائے تو اپنے کو اس گدھے کے برابر کر دیتا ہے جس کا میں نے ذکر کیا۔ اور اگر خاموش رہے اور کوئی کرامت نہ دکھائے تو آپ کے دل میں گزرے گا کہ اس شخص میں صفائی نہیں ہے۔ یہ کہہ کر شیخ نے بادشاہ کی طرف اس سیب کو پھینک دیا۔

حضور کا اشارہ بالکل درست ہے کہ مذہب اور تصوف کی بنیاد کشف اور کرامت یا کسی قسم کے خرقِ عادت پر نہیں رکھی جا سکتی ہے۔ تصوّف کی بنیاد عقلِ سلیم، اعتقادِ صحیح اور عملِ صالح پر ہے۔ جرمن فلاسفر کانٹ کا نظریہ ہے کہ احکام اخلاق پر آدمی کے دل میں عالمِ غیب (جس کو وہ عالمِ غیر حسیات یا نومنیا کہتا ہے) سے آتے ہیں۔ حضور کے خیالات کانٹ کے اس نظریے سے بہت ملتے ہیں۔ کسی نے حضور سے دریافت کیا کہ خدا کے احکام بندوں پر کس طرح آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ایک فرشتہ ملہم ہے جو ان احکام کو لاتا ہے۔ لیکن جب سوال کرنے والے نے تفتیش کرنا چاہی تو آپ نے فرمایا کہ خدا کے احکام آدمی کے دل میں آتے ہیں، کوئی فرشتہ درمیان میں نہیں ہے۔

ساتواں باب

اخلاقی تعلیمات

شرائطِ شیخی۔ حضور نے اپنے استاد علاء الدین اصولی اور دیگر بزرگوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ اگر ان کو پیرِ کامل کا ہاتھ ملا ہوتا تو وہ بھی کامل ہو جاتے لیکن پیرِ کامل کا ملنا کتنا مشکل ہے؟ حضور کے اصول کے مطابق شیخِ کامل کا معیار حسبِ ذیل ہے:

اوّل، یہ وراثت کا سوال نہیں ہے۔ جب حسن سجزی نے اپنے غلام ملیح کو آزاد کیا تو حضور نے فرمایا کہ "اس راہ میں خواجگی اور غلامی نہیں ہے، جو شخص عالم محبت میں درست رہا اس کا کام بن گیا۔" (۵ رشعبان ۷۰۸ھ)۔ ایک اور جگہ آپ نے فرمایا ہے۔ شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے اصلی بیٹے شیخ فرید تھے۔ بعد کے صوفی شیخوں نے اپنے بیٹوں کو خلافت نامہ دے کر تصوف کو ایک خاندانی ذریعۂ معاش بنا لیا ہے۔ یہ بالکل اصول کے خلاف ہے۔

دوم، فنِ شیخی کا مقصد خدمتِ خلق ہے۔ شیخ میں بہت خوبیوں کی ضرورت ہے۔ صرف عبادت گزار ہونا کافی نہیں ہے۔ غالباً ایک مثال سے یہ اصول سمجھ میں آجائے گا۔ حضور فرماتے ہیں کہ "ایک رات شیخ بہاء الدین زکریا نے حاضرانِ مجلس کی طرف رخ کر کے اُن سے پوچھا کہ تم میں سے کوئی ہے جو دو رکعت نماز

پڑھے اور ایک رکعت میں ختم قرآن کرے؟ حاضرین میں سے کوئی اس کا ذمہ دار نہ ہوا۔ شیخ بہاء الدین خود آگے بڑھے۔ پہلی رکعت میں آپ نے پورا قرآن اور چار پارے پڑھے۔ اور دوسری رکعت میں سورۂ اخلاص پڑھ کر نماز ختم کردی۔" (۱۳ رمضان ۷۰۸ھ) لیکن جب حضور سے کسی نے پوچھا کہ آپ روزانہ کس قدر تلاوت قرآن کرتے ہیں تو آپ نے جواب دیا کہ ایک پارہ۔[1] اس بارے میں امیر خورد لکھتے ہیں: "کوئی شخص اس بات کا قائل نہیں ہے کہ حضور چار یا پانچ سو رکعتیں بالالتزام پڑھا کرتے تھے یا اس قدر تسبیح پڑھتے تھے ..... آپ ہمیشہ تالیفِ قلوب میں مصروف رہے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ مجھے ایک خواب میں ایک کتاب دی گئی جس میں لکھا تھا کہ جہاں تک ہو سکے دلوں کو راحت پہنچاؤ۔"[2]

سوم، سوال روحانی آزادی کا ہے جس کو شیخ نصیر الدین غنا، کہتے ہیں۔ جو شخص دوسروں کی نوکری کرتا ہے وہ اس کی "تحکیم" میں آجاتا ہے۔ اس معاملے میں حضور بہت سخت تھے۔ ایک جگہ امیر حسن سجزی لکھتے ہیں: "گفتگو اصحاب شغل اور نوکری پیشہ مردوں کے بارے میں ہوئی۔ حضور نے فرمایا کہ کم ہوتا ہے کہ جس نے (حکومت سے) شغل اور نوکری حاصل کی ہو اور آخر میں سالمت رہا ہو۔" (۱۱ ذیقعد ۷۰۸ھ)۔ اس بات کو تو اس زمانے کے امراء اور ملوک کی تاریخ ثابت کرتی ہے۔ مثلاً ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی میں بہ حوالہ ۱۳۵۶ء لکھتے ہیں کہ بلبن اتنا بڑا بادشاہ تھا، اس کے اتنے امراء ملک اور خان تھے اور اس نے قریب چالیس برس تک بہ حیثیت الغ خان اور سلطان کے

---

[1] سیر الاولیاء، ترجمہ مولانا بریان، صفحہ ۴۳۴

[2] " " ، صفحہ ۱۳۶

دہلی پر حکومت کی۔ لیکن اس وقت نہ اس کے خاندان کا کوئی شخص باقی ہے اور نہ اس کے امراء کے خاندان کا۔ خوف یہ تھا کہ حکومت اسی طرح صوفیاء کرام پر قابو پالے گی جیسے علماء ظاہری پر جو اس کی نوکری میں ہوتے ہیں' اور جن کو حکومت کی پالیسی پر چلنا پڑتا ہے۔ حضور نے اپنے ایک مرید قاضی محی الدین کاشانی کو خلافت نامہ دیا۔ قاضی محی الدین کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور اُن کے گھر میں فاقہ ہونے لگا۔ سلطان علاء الدین خلجی کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے قاضی محی الدین کو ان کے خاندانی عہدے پر اودھ کا قاضی مقرر کردیا۔ قاضی محی الدین حضور کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یہ سلطانی فرمان بغیر میری درخواست کے جاری ہوا ہے۔ لیکن حضور بہت خفا ہوئے اور اپنے خلافت نامے کو واپس لے لیا۔ لیکن ایک سال کے بعد آپ نے ان کی خطا معاف کردی۔

چہارم۔ حضور کے فلسفۂ تصوّف میں صوفی شیخ کے لیے فتوح (یعنی جو کچھ اس کو خلق خدا سے بغیر مانگے ہوئے ملے) کے علاوہ کوئی اور ذریعۂ معاش جائز نہ تھا۔ جب آپ کسی خلیفہ کو ترکِ دنیا کا حکم دیتے تھے تو اس کے معنی تھے کہ فتوح پر زندگی بسر کرو۔ لیکن ترکِ دُنیا کا اصول عوام کے لیے نہ تھا۔ گفتگو صفتِ دنیا کے بارے میں شروع ہوئی۔ یعنی دنیا کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو کچھ بھی کفاف یا خرچ لازمی سے زیادہ ہو' وہ صورت اور معنی میں دنیا ہے۔ طاعتِ خدا اخلاص کے ساتھ صورت اور معنی میں دنیا نہیں ہے۔ ریاکاری کی عبادت جس سے فائدہ کی اُمید ہو' وہ صورت میں دنیا نہیں معلوم ہوتی لیکن معنی اصل میں دنیا ہے۔ آخر میں وہ سب کام جو ایک شخص اپنی بی بی اور گھر والوں کی روزی فراہم کرنے کے لیے کرتا ہے تاکہ ان کا حق ادا کرے' یہ صورت

میں دنیا معلوم ہوتی ہے لیکن معنی میں دنیا نہیں ہے۔" (۲۹ ذی الحجہ ۱۴...ھ)

اُس کے بعد شیخ نصیر الدین نے فرمایا کہ حدیث میں آیا ہے۔ "کل من کد یمینک وعرق جبینک ولا تاکل من دینک۔ یعنی کھاؤ وہ جو تم نے اپنے ہاتھ کی محنت اور اپنی پیشانی کے پسینے سے پیدا کیا ہے لیکن اپنے دین کو بیچ کر مت کھاؤ....

پھر آپ نے فرمایا کہ دین بیچنے کے یہ معنی ہیں کہ درویش پھٹے کپڑے پہنے سر پہ ٹوپی رکھے اور ملوک اور امرا کے گھر جائے اور کہے کہ میں درویش ہوں مجھے کچھ دو۔ یا کسی دولت مند کی مسجد میں جائے اور بہت نماز پڑھتا رہے تا کہ صاحب مسجد کو خبر ہو۔ یا پانچ آیاتِ قرآن پڑھتا ہوا گھر گھر جائے (کچھ ملنے کی اُمید میں[۱])۔

اسی مسئلے کو شیخ نصیر الدین نے ایک قصّے کے پیرایے میں سمجھایا ہے۔ ایک بادشاہ نے حکم دیا کہ سب حاجت مندوں کو حق ہوگا کہ اس کے دربار میں بلا خوف خطر آسکیں گے۔ دربان حاجت مندوں کی عرضداشتیں لے کر بادشاہ کے ہاتھ میں دے دیتے تھے۔ ایک دن ایک درویش اپنے پیوند لگے ہوئے کپڑوں میں آیا اور چاہتا تھا کہ اپنی عرضداشت لے کر بادشاہ تک دوسروں کی طرح پہنچ جائے دربان نے آواز دی کہ آگے مت جاؤ۔ درویش نے وجہ دریافت کی۔ دربان نے کہا: یہ لباس جو تم نے پہنا ہے اولیاءِ خدا کا لباس ہے۔ اس لباس والے اس بادشاہی دروازے پر نہیں آتے ہیں۔ تم واپس جاؤ اور دنیا داروں کا لباس پہن کر آؤ اور میں تم کو بادشاہ تک جانے دوں گا۔ لیکن اس لباس کی تعظیم

---

[۱] خیر المجالس، مجلس بست دیکم، صفحہ ۷۷

مجھے مجبور کرتی ہے کہ تم کو بادشاہ تک نہ جانے دوں۔" درویش نے یہ بہتر سمجھا کہ اپنا لباس نہ بدلے اور بادشاہ تک نہ جائے۔

انسانی تعلقات کی بنیاد۔ جہاں تک چشتی سلسلے کے بزرگ مشائخ کی تلقین ہے، ان کی کوشش تھی کہ انسانی تعلقات بہت سادہ اصول پر رکھے جائیں یعنی نیکی کے بدلے میں نیکی اور برائی کے بدلے میں بھی نیکی۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیم اسی بنیاد پر ہے۔ ہمارے زمانے میں مہاتما گاندھی جی نے بھی اسی اصول کی تعلیم دی ہے۔ بدقسمتی سے اب تک کوئی صحیح اصطلاح اس اصول کے لیے نہیں ملی ہے۔ انگریزی الفاظ 'نان وائلنس' اور 'پیسیفزم' اور ہندی لفظ 'اہنسا' میں وہ محبت کا عنصر نہیں ظاہر ہوتا جو اس تعلیم کی اصلی بنیاد ہے۔ اسلامی شریعت کی بنیاد قانون پر ہے لیکن ان صوفیاء کرام نے اخلاق کی بنیاد اس اصول 'عفو' پر رکھی ہے جس کو قرآن نے بہتر سمجھا ہے۔ یعنی اگر تم عفو کرو اور معاف کردو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ ذیل کے اقتباسات سے حضور کے خیالات صاف طور سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔

گفتگو تحمل کے بارے میں ہوئی۔ حضور نے فرمایا کہ معاملات خلق کے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ قسم اول، یہ کہ ایک شخص کو دوسرے سے نہ فائدہ ہو نہ نقصان اور یہ حکم جماد (یا پتھروں) کا ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ ایک شخص کو دوسرے سے نفع پہنچے اور نقصان نہ پہنچے۔ تیسری قسم ان دونوں سے بہتر ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص سے دوسروں کو فائدہ پہنچے، اور اگر کوئی اس کو نقصان پہنچائے تو وہ اس کو برداشت کرے اور بدلہ لینے کی کوشش نہ کرے۔ اور یہ کام صدیقوں کا ہے۔[1] (۱۰ رجب سنہ ۷۲۰ھ)

---

[1] مجلس نودوہفتم۔ صفحہ ۲۷۲ - ۲۷۳۔

اس کے بعد حضور نے تحمّل اور بردباری پر بہت اصرار کیا اور فرمایا کہ ظلم کو برداشت کرنا بہتر ہے، جو کچھ ظلم ہو اس کو برداشت کرنا چاہیے اور بدلہ لینے کی کوشش نہ کرنا چاہیے۔ پھر آپ نے اپنی زبانِ مبارک سے ان اشعار کو پڑھا:

ہر کہ با ما یار نہ بود، ایزد او را یار باد
وانکہ ما را رنجہ دارد، راحتش بسیار باد
ہر کہ او در راہِ ما خاری نہد از دشمنی
ہر گلی کز باغ عمرش بشگفد بی خار باد

پھر آپ نے فرمایا کہ دوسرا آدمی کانٹا رکھتا ہے اور تو بھی کانٹا رکھتا ہے، تو یہ کانٹا کانٹے کا مقابلہ کرتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ عام آدمیوں کا یہ اصول ہے، نیک کے ساتھ نیکی اور بد کے ساتھ بدی۔ لیکن درویشوں کا اصول یہ ہے، نیکوں کے ساتھ نیکی اور بدوں کے ساتھ بھی نیکی۔" (۲۶ ربیع الاول ۷۱۲ھ)

مجلس مورخہ ۲ صفر ۷۱۳ھ میں امیر حسن سجزی لکھتے ہیں: " حاضرینِ مجلس میں سے ایک نے عرض کیا کہ بعضے آدمی کیا بر سرِ منبر اور کیا دوسری جگہ، حضور کو برابر بُرا کہتے ہیں۔ اب ہم اس سے زیادہ نہیں سُن سکتے۔ حضور نے فرمایا کہ میں نے ان سب کو معاف کر دیا۔ اس وجہ سے آدمیوں کو عداوت اور مخالفت میں مشغول نہ ہونا چاہیے۔ اگر کوئی مجھے بُرا کہتا ہے تو میں اس کو معاف کر رہا ہوں۔ تم کو بھی معاف کرنا چاہیے اور عداوت نہ مول لینا چاہیے۔"

پھر حضور نے فرمایا کہ چھجو ساکن اندپت (اندرپت) برابر مجھے بُرا کہتا تھا اور میری بُرائی چاہتا تھا۔ بُرا کہنا سہل ہے لیکن بُرا چاہنا اس سے بدتر ہے۔ جب

بچھو مرگیا تو میں اس کے سوم کے دن اس کی قبر پر گیا اور دعا کی : یا الٰہی جو کچھ اس شخص نے میری بدی میں کہا یا سوچا ہے، میں اس کو معاف کرتا ہوں، یا خدا میری وجہ سے اس کو کوئی سزا نہ دے۔"

اسی معنی میں آپ نے فرمایا کہ اگر دو آدمیوں میں جھگڑا ہوتا ہے تو صحیح راستہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک اپنے دل کو صاف کردے۔ اگر ایک نے اپنے دل کو صاف کر دیا تو دوسرے کی طرف سے بھی عداوت کم ہو جائے گی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ لوگ بُرا کہنے سے کیوں رنجیدہ ہوتے ہیں۔ مقولہ ہے کہ صوفی کے مال میں سب شریک ہیں اور اس کو قتل کرنا معاف ہے۔ جب اصول یہ ہے تو صرف بُرا کہنے پر کیوں جھگڑا کرتے ہو۔"

مجلس ۱۰ ر جمادی الاول ۱۴۔۱۳۷ھ۔ "حضور نے فرمایا کہ دو چیزیں ہیں: نفس اور قلب۔ اگر ایک شخص نفس حیوانی سے پیش آتا ہے تو دوسرے کو قلب (روحِ انسانی) سے کام لینا چاہیے۔ نفس کی فطرت میں دشمنی، غوغا اور فتنہ ہے۔ قلب میں سکون، رضا اور محبت ہے۔ پس اگر ایک آدمی نفس سے کام لیتا ہے اور دوسرا قلب سے، تو نفس مغلوب ہو جائے گا۔ لیکن اگر فریقین نفس کا نفس سے مقابلہ کریں تو جھگڑے اور فتنے کی کوئی حد نہیں رہتی ہے۔"

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اگر ایک شخص دوسرے پر ظلم کرے اور دوسرا شخص تحمل سے ظلم کو برداشت کرے، تو برتری اس شخص کو حاصل ہے جو ظلم کو برداشت کرتا ہے نہ کہ اس شخص کو جو ظلم کرتا ہے۔ (۱۰ ر جمادی الاول ۱۵۔۱۳۷ھ)

مجلس مورخہ ۲۰ ر ربیع الاول ۱۶۔۱۳۷ھ۔ "اس روز ایک آدمی کو چاقو کے ساتھ جماعت خانے میں پکڑا گیا۔ خدا جانے وہ کون تھا اور کیا چاہتا تھا۔ حضور کو اس بات کی خبر کی گئی۔ آپ نے اس کی اجازت نہیں دی کہ اس کو کہیں

لے جائیں۔ یا کسی قسم کی تکلیف دیں۔ آپ نے اس کو بلا بھیجا اور کہا کہ تو وعدہ کر کہ کسی مسلمان پر حملہ نہیں کرے گا۔ اس نے یہ وعدہ کیا۔ حضور نے اس کو آزاد کیا اور خرچ بھی دیا۔"

مجلس مورخہ ۱۲ شعبان ۷۰۹ھ۔ "امیر حسن سجزی دیوگیر فوج کے ساتھ گئے تھے اور آٹھ مہینے کے بعد حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لشکر میں خبر پھیلی تھی کہ آپ پر کسی نے جادو کیا ہے۔ امیر حسن سجزی نے واقعات دریافت کیے۔ حضور نے فرمایا کہ میں دو مہینے تک بیمار رہا اور بیماری سخت تھی۔ پھر ایک شخص کو لائے جو علامات سحر کے دریافت کرنے میں مہارت رکھتا تھا۔ وہ شخص آیا اور دروازے کے سامنے اور اس کے چاروں طرف گھوما۔ ہر جگہ سے کچھ مٹی اٹھا کر سونگھتا تھا۔ ایک جگہ مٹی کو سونگھا اور کہا کہ یہاں کھودو۔ کھودنے پر علامات سحر ظاہر ہوئیں، اور اسی کے ساتھ میری بیماری میں بھی کمی ہوگئی۔ اس شخص نے کہا کہ مجھے اتنی مہارت ہے کہ اگر حکم ہو تو میں ان لوگوں کے نام بتا سکتا ہوں جنھوں نے یہ جادو کیا ہے۔ جب مجھے اس کی خبر ہوئی تو میں نے کہلا بھیجا کہ ہرگز کسی کا نام نہ لو۔ جس نے جو بھی کیا ہے میں اس کو معاف کرتا ہوں۔"

مجلس مورخہ ۱۵ محرم ۷۱۰ھ میں امیر حسن سجزی لکھتے ہیں: "یہ حکایت بیان ہو رہی تھی جب ایک فقیر اچانک آیا اور کچھ سخت باتیں کہیں جو حضور کی مجلس کے لیے زیبا نہ تھیں۔ حضور نے کوئی جواب نہ دیا اور جو اس کی امید تھی اس کو پورا کر دیا۔ پھر آپ نے حاضرین کی طرف رخ کر کے کہا کہ اس چیز کی بھی ضرورت ہے۔ بہت لوگ آتے ہیں جو اپنا سر میرے پیروں پر رکھ دیتے ہیں اور کچھ تحفہ بھی لاتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں کی بھی ضرورت ہے جو آئیں اور بے محابا جو کچھ زبان پر آئے کہیں۔ اس چیز سے اس چیز کی تلافی ہو جاتی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا

کہ ایک وقت ان پریشان باتیں کرنے والوں میں سے ایک شخص میرے پاس آیا اور مجھے بہت برا بھلا کہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر میں اس نے کہا کہ جب تک دنیا قائم ہے میرا جرم قائم رہے اور تمھارا صبر۔"

غالباً ہندوستان کی تاریخ میں کبھی اتنی لڑائیاں نہیں ہوئی ہیں جتنی ان پندرہ سالوں میں جن میں فوائد الفواد قلمبند کی گئی۔ پھر بھی جن لوگوں کو اس کا گھمنڈ ہے کہ وہ انسانی فطرت کو خوب سمجھتے ہیں یہ کہیں گے کہ اس اصولِ امن و محبت اور عفو پر کوئی انسانی سماج قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ بہت لمبی بحث ہے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ جتنا کشت و خون بیسویں صدی عیسوی میں ہوا ہے اتنا کسی زمانے کی انسانی تاریخ میں نہیں ملتا ہے اور وہ تمام آلاتِ حرب جن سے نوعِ انسانی کی تاریخ کو ختم کیا جا سکتا ہے تیار ہو چکے ہیں۔ بدقسمتی سے سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کی اخلاقی ترقی نہیں ہوئی ہے۔

لا آف نیچر یا قانون فطرت۔ جب سر سید احمد خاں نے لا آف نیچر پر لکھنا شروع کیا تو ہمارے علماء نے اس پر بہت اعتراض کیا۔ حالانکہ اس کی ہم معنی اصطلاحات، مثلاً فطرت اللہ اور سنت اللہ قرآن پاک میں موجود ہیں۔ بہر حال اقوام یورپ کی اصطلاح میں نیچر ایک بہت مبہم لفظ ہے جس کے کم از کم تین معنی ہوتے ہیں جن کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (۱) یونانِ قدیم میں نیچر کے معنی ہوتے تھے وہ مقصد جس کے لیے آدمی کوئی اوزار بنائے۔ اس طرح ارسطا طالیس نے لکھا ہے کہ چاقو کی فطرت لکڑی کاٹنا ہے اور قینچی کی فطرت کپڑا کاٹنا ہے۔ (۲) پھر فلاسفروں نے سوال اٹھایا کہ انسان کے بنانے میں خدا کا کیا مقصد تھا۔ جواب دیا گیا کہ اپنی فطرت پر عمل کرنا لیکن فطرت کے معنی قانونِ اخلاق یا قانونِ خدا کے ہوئے۔ قدیم اور ازمنۂ وسطیٰ یورپ

میں قانون فطرت کے یہی معنی سمجھے جاتے تھے۔ (۳) پھر موجودہ سائنس نے دریافت کیا کہ ہمارے ماحول میں دو چیزیں ہیں، مادّہ اور انرجی (قوتِ حرکت)۔ جہاں تک ہمارے تجربے نے دریافت کیا ہے مادّہ اور انرجی قوانین کے مطابق عمل کرتے ہیں اور ان قوانین میں کوئی تبدیلی ناممکن ہے۔ نیچر یا فطرت کے ان تینوں معنوں میں ہم کو صرف دوسرے معنی سے تعلق ہے۔ دو باتیں ظاہر ہیں۔ اول تمام جاندار چیزوں میں سے صرف انسان پر قانون اخلاق لاحق ہوتا ہے۔ دوسرے آدمی کے لیے قانون اخلاق ایک بے معنی بات ہوتی اگر اس کو خیالات اور عمل میں آزادی نہ ہوتی۔ آزادی کے بغیر اخلاق ناممکن ہے۔

شیخ نصیر الدین نے مشہور قرآن کی آیت کا حوالہ دیا ہے جس کے معنی حسب ذیل ہوتے ہیں:

"ہم نے اپنی امانت کو آسمان اور زمین اور پہاڑ پر عرض کیا لیکن وہ ڈرے اور اس کو قبول نہ کیا۔ لیکن اس کو انسان نے قبول کیا"[1] اس بنا پر آپ کہتے ہیں کہ اس حکم پر آدمی کو عمل کرنا چاہیے: "تخلقوا باخلاق اللہ" یعنی اپنے میں خدا کے اخلاق پیدا کرو۔[2]

حضور کی اخلاقی تعلیم کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:

(۱) جدوجہد۔ اخلاقی زندگی کے لیے انسانی کوشش (یعنی جدوجہد)

---

[1] "انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنہا و اشفقن منہا وحملہا الانسان انہ کان ظلوماً جہولاً" (صفحہ ۲۷۶)

[2] ظاہر ہے کہ خدا کے اخلاق کو کوئی دریافت نہیں کر سکتا۔ ہم انہی اخلاقی احکام پر عمل کر سکتے ہیں جن کا حکم ہمارے دل یا روح کو پہنچتا ہے۔ (صفحہ ۱۰۷)

ضروری ہے۔ امیر حسن سجزی لکھتے ہیں کہ میں نے یہ دو شعر حضور کی زبانِ مبارک سے سُنے ہیں:

" گرچہ ایزد دہد ہدایت دیں
بندہ را اجتہاد باید کرد
نامۂ کان بحشر خواہی خواند
ہم ازیں جا سواد باید کرد "

(۱۵ / شعبان ۷۰۸ھ)

ایک اور جگہ حضور نے امیر حسن سجزی کی طرف رُخ کر کے کہا: " اگرچہ فیضِ ایزدی نازل ہے، پھر بھی آدمی کو اپنی طرف سے جدوجہد کرنا چاہیے۔" (۲۲ / شعبان ۷۰۸ھ) یہ اصول صرف اصولِ اخلاق میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں پایا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔

(۲) طاعتِ لازمی اور طاعتِ متعدّی۔ مذہبی لوگ اس کو بھول جاتے ہیں کہ جو شخص صرف مذہبی دعا، نماز وغیرہ سے اپنی فلاح یا جنّت حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کی زندگی میں ایک بنیادی خود غرضی ہے۔ یعنی وہ اپنی جماعت کی کوئی خدمت نہیں چاہتا ہے اور صرف اپنی ذات کی بھلائی چاہتا ہے۔ حضور کے فلسفے میں اخلاق کی بنیاد خدمتِ خلق پر ہے۔ چنانچہ مجلس مورخہ ۳ / محرم ۷۰۸ھ میں امیر حسن سجزی لکھتے ہیں:

" گفتگو طاعت کے بارے میں ہوئی۔ حضور نے فرمایا کہ طاعت دو قسموں کی ہوتی ہے، لازمی اور متعدّی۔ طاعت لازمی وہ ہے جس کا فائدہ صرف طاعت کرنے والے کے نفس کو پہنچے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، اوراد، تسبیحات اور اس قسم کی چیزیں۔ طاعت متعدّی [illegible] ہے جس کی راحت اور منفعت دوسروں کو پہنچے۔ یعنی ا[illegible]

محبت اور شفقت کے ساتھ، جہاں تک اُس کے بس میں ہو، دوسروں کی خدمت کرے۔ اس کو طاعت متعدیہ کہتے ہیں اور اس کا ثواب حد اور اندازہ سے زیادہ ہے۔ طاعت لازمی کے لیے خلوص نیت ضروری ہے لیکن طاعت متعدّیہ جس طرح سے بھی ہو باعث ثواب ہے۔" طاعت متعدیہ کی اچھی مثالیں وہ کام ہیں جن کی وجہ سے خلق خدا کو فائدہ پہنچتا ہے، مثلاً کنویں کھدوانا، سڑکیں بنانا، پُل بنانا۔ بدقسمتی سے اُس زمانے میں موجودہ سائنس کے معلومات نہیں تھے، اس لیے ان پبلک امور میں زیادہ توسیع کی گنجایش نہیں تھی۔ ہمارے زمانے میں طاعت متعدیہ کی بہت توسیع ممکن ہے اور موجودہ حکومتوں کے پروگرام میں یہ ایک بڑا فرض ہے۔

(۳) حُسنِ عمل۔ حضور اور مشائخ کی طرح نماز روزہ کی تلقین کرتے تھے لیکن آپ کی تلقین کا بڑا اصرار حُسنِ عمل یعنی نیک کام کرنے پر تھا۔ مجلس مورخہ ۱۱ ذی الحجہ ۷۰۸ھ میں امیر حسن سجزی لکھتے ہیں: پھر حضور نے اس بھید کو جو اور تمام بھیدوں کا بھید ہے بیان کیا۔ یعنی طاعت (عبادت) چاہے کم ہو، صدق (سچائی) کی کثرت ہونا چاہیے۔ عباد (یعنی کثرت سے عبادت کرنے والوں) کے بارے میں آپ نے فرمایا ہے کہ ان کا دل دنیا میں مشغول رہتا ہے۔ (۱۱ صفر ۷۱۵ھ) اسی طرح شیخ نصیر الدین فرماتے ہیں: "راہِ تصوف صدق اور سچائی کا راستہ ہے۔ اگر ایک شخص میں کوئی اور عبادت نہ ہو سوائے پانچ وقت کی نماز کے، وہ اس شخص سے بہتر ہے جس میں عبادت بہت ہے لیکن سچائی نہیں ہے[1]۔"

حضور کا نظریہ چند مثالوں سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

---

[1] خیر المجالس، مجلس چہل و یکم

لاہور کی بربادی۔ حضور نے فرمایا کہ ایک اور وجہ لاہور کی بربادی کی یہ تھی کہ انھیں دنوں بعضے لاہور کے (مسلمان) تاجر گجرات گئے۔ اس زمانے (یعنی سنہ ۱۲۴۰ء) میں گجرات میں ہندوؤں کی حکومت تھی۔ ہندو اس مال کو جو یہ لائے تھے خریدنے کے لیے آئے۔ لاہور کے تاجروں نے ہر اسباب کے دام زیادہ بتائے۔ جو چیز دس درہم میں سستی تھی، اس کے دام بیس درہم بتائے، اور جو چیز بیس درہم میں سستی تھی اس کے دام چالیس درہم بتائے۔ لیکن جب اصل بیچنے کا وقت آیا تو اپنے مال کو اصلی قیمت یعنی جو قیمت انھوں نے مانگی تھی اس کے آدھے پر بیچنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس مقام کے ہندوؤں میں یہ رسم نہ تھی۔ وہ اپنے مال کی قیمت صحیح بتاتے تھے اور اپنی بات پر قائم رہتے تھے۔ الغرض جب ہندوؤں نے ان کے معاملہ کرنے کا طریقہ دیکھا تو ایک ہندو نے سوال کیا کہ تم کس شہر سے آتے ہو۔ جواب دیا لاہور سے۔ پھر اس ہندو نے پوچھا کہ کیا تمھارے شہر میں سودا اسی طرح سے ہوتا ہے۔ جواب دیا کہ ہاں۔ پھر ہندو نے پوچھا کہ کیا تمھارا شہر آباد ہے۔ جواب دیا کہ ہاں۔ پھر ہندو نے کہا کہ وہ شہر جس میں معاملہ اس طریقے سے ہوتا ہے آباد نہیں رہ سکتا ہے۔ الغرض یہ تاجر واپس ہوئے لیکن وہ راستے ہی میں تھے کہ خبر آئی کہ مغل (یعنی اگتائی خاں کے منگول) آئے اور انھوں نے لاہور کو برباد کر دیا۔[۱] (۲۸ محرم سنہ ۷۱۴ھ)

---

[۱] منگولوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کو برسوں کے لیے ویران کر دیا۔ لیکن لاہور کی فتح کے بعد ان کو خبر ملی کہ اگتائی خان (چنگیز خان کے بیٹے اور وارث) کا انتقال ہو گیا۔ منگولوں کا قاعدہ تھا کہ جب ان کا خان مر جائے تو اپنی تمام لڑائیاں ختم کر دیں۔ اس لیے لاہور کے لوٹنے کے بعد منگول فوجیں واپس گئیں اور انھوں نے لاہور پر اپنا قبضہ نہیں رکھا۔

فضیلت اطعام۔ اس زمانے میں اکثر شہروں میں فاقہ کشی کا خوف رہتا تھا۔ اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ نقل و حمل (ٹرانسپورٹ) کے کوئی ذرائع نہ تھے۔ دوسری وجہ حاکم طبقے کا ظلم تھا۔ چاہے مسلم بادشاہ کا حکم ہو یا ہندو راجہ کا، خوش حالی صرف حاکم طبقے میں پائی جاتی تھی۔ دہلی میں علاء الدین خلجی کے زمانے میں کچھ لنگر خانے تھے جیسے لنگر خانہ رمضان قلندر، لنگر خانہ ملک یار پراں اور دوسرے لنگر خانے جہاں پبلک کو بلا تخصیص مذہب کے پکا کھانا یا کچی جنس مل سکتی تھی۔ مجلس مورخہ ۲۵ جمادی الاول ۷۰۸ھ میں امیر حسن سجزی لکھتے ہیں: "ذکر لوگوں کو کھانا دینے کی فضیلت کے بارے میں ہوا۔ حضور نے فرمایا، خلق کو کھانا دینا بہت نیک کام ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ شیخ رکن الدین چشتی کے بڑے بیٹے خواجہ علی، خروج تتار میں گرفتار ہو گئے اور ان کو چنگیز خاں کے سامنے لایا گیا۔ اس خانوادے کے ایک بزرگ مرید وہاں موجود تھے اور ان کا وہاں (دربار چنگیزی میں) کچھ اثر بھی تھا۔ خواجہ علی کو گرفتار دیکھ کر وہ حیران ہوئے اور اپنے دل میں سوچنے لگے کہ ان کی رہائی کس طرح حاصل کروں۔ اور کس طرح اس معاملے کو چنگیز خاں کے سامنے پیش کروں۔ اگر میں کہوں کہ بڑے باکرامت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں تو چنگیز کیا سمجھے گا اور اگر ان کی طاعت اور عبادت کا ذکر کروں تو یہ چنگیز کے لیے بے معنی ہوگا۔ آخر کار بہت سوچنے کے بعد وہ چنگیز خاں کے پاس گئے اور کہا کہ اس قیدی کو رہا کر دینا چاہیے، ان کے باپ ایک بزرگ آدمی تھے اور خلق کو کھانا دیتے تھے۔ چنگیز نے پوچھا کہ اپنے آدمیوں کو کھانا دیتے تھے یا غیروں کو۔ آپ نے کہا کہ اپنے ساتھیوں کو تو ہر بڑا آدمی کھانا کھلاتا ہے۔ اس کے باپ بیگانہ لوگوں کو کھانا دیتے تھے۔ چنگیز خاں کو یہ بات پسند آئی، اس نے کہا کہ نیک آدمی تھے اگر خلق خدا کو کھانا دیتے تھے۔ پھر چنگیز نے

خواجہ علی کی رہائی کا حکم دیا، معذرت کی اور خلعت بھی عطا کیا۔ آخر میں حضور نے فرمایا کہ کھانا دینا تمام مذہبوں کے مطابق ایک پسندیدہ بات ہے۔"

جواد، سخی اور بخیل۔ حضور نے فرمایا کہ "پرانے مذاہب میں زکوٰۃ آمدنی کا چوتھا حصہ ہوتی تھی۔ ہمارے رسولؐ کے زمانے میں زکوٰۃ دو سو درہم پر پانچ درہم ہو گئی۔ لیکن اگر کوئی دو سو درہم میں سے پانچ درہم دے تو صرف یہ ہے کہ اس کو بخیل نہیں کہہ سکتے اور بخل کا الزام اس پر نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن اس کو سخی نہیں کہہ سکتے۔ سخی وہ ہے جو زکوٰۃ سے زیادہ دے۔"

پھر آپ نے سخی اور جواد کا فرق بتایا۔ سخی وہ ہے جو زکوٰۃ سے زیادہ دے لیکن جواد وہ ہے جس کی بخشش بہت زیادہ ہو۔ مثلاً دو سو درہم میں سے پانچ اپنے پاس رکھے اور باقی تقسیم کر دے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ شیخ فرید کہتے تھے کہ زکوٰۃ تین قسم کی ہوتی ہے: زکوٰۃ شریعت، زکوٰۃ طریقت اور زکوٰۃ حقیقت، زکوٰۃ شریعت یہ ہے کہ دو سو درہم میں سے پانچ درہم خیرات میں دے، زکوٰۃ طریقت یہ ہے کہ دو سو درہم میں سے صرف پانچ اپنے پاس رکھے، لیکن زکوٰۃ حقیقت یہ ہے کہ اپنے پاس کچھ نہ رکھے اور جو کچھ ہے وہ خیرات میں دے دے۔" (۲۹ جمادی الآخر ۷۱۲ھ)۔ اسی قسم کا حکم حضرت عیسیٰ کا ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ بیچ کر فقرا میں تقسیم کر دو۔

قصۂ دیوانہ و درویش۔ سب سے زیادہ صاف طور پر آپ کے اصول حسنِ معاملہ کا اظہار ایک درویش اور دیوانہ، جو صوفی مجذوب تھا، کے بیان سے ہوتا ہے۔ آپ نے درویش کا نام نہیں لیا ہے لیکن اس کا بیان حسب ذیل ہے: "میں گجرات گیا اور وہاں میں ایک دیوانے سے ملا جو واصل اور صاحب کشف تھا۔ ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے تھے اور ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ میں

ایک وقت اس شہر کے حوض کی طرف پہنچا جس کی حفاظت کرتے تھے اور جس میں کسی کو پیر نہیں رکھنے دیتے تھے۔ میری اس حوض کے نگاہبان سے دوستی تھی اور اس نے مجھے وضو کرنے کی اجازت دی۔ پھر کچھ عورتیں پانی بھرنے آئیں لیکن ان کو حوض میں پیر رکھنے کی اجازت نہ دی گئی۔ آخر کار ایک بڑھی عورت میرے پاس آئی اور کہا کہ میرے برتن میں پانی بھر کر مجھے دے دو۔ میں نے بڑھیا کا برتن بھر کر اس کو دے دیا۔ پھر ایک اور عورت آئی اور اس کا بھی برتن میں نے بھرا۔ اسی طرح چار پانچ عورتوں کے برتن میں نے بھر کر دیے۔ جب میں اپنے کمرے میں واپس آیا تو دیوانہ سو رہا تھا۔ نماز کا وقت تھا، میں نے بہ آوازِ بلند تکبیر پڑھی اور ارادہ تھا کہ نماز پڑھوں۔ دیوانہ جاگ پڑا اور مجھ سے کہا، یہ کیا شور و غوغا ہے، تیرا ایک کام تو یہی تھا کہ تو نے ان عورتوں کے برتنوں میں پانی بھر کر ان کو دیا" (۱۱ ذی الحجہ ۷۱۶ھ)

لقمۂ حلال۔ لقمۂ حلال کے معنی وہ جائز ذریعۂ روزی ہے جس سے کام کرنے والے اور اس کے خاندان کی پرورش ہو اور سماج یا سوسائٹی کی خدمت بھی ہو۔ بدقسمتی سے انسانی تاریخ میں قدیم مصر اور بابل اور نینوا کے زمانے سے لے کر ہر سوسائٹی میں ایک حکمراں طبقہ پیدا ہو گیا جس نے اپنے زورِ بازو اور دیگر ترکیبوں سے سوسائٹی کی پیداوار اور آمدنی پر قابو پا کر عوام الناس کو تنگدستی اور فاقہ کشی کی حالت میں چھوڑ دیا ہے۔ حضور شیخ نظام الدین کا فلسفۂ تصوف اس طبقے کے خلاف ایک سخت احتجاج تھا حالانکہ آپ نے بہت ملائم الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مثلاً آپ نے کاشتکاری اور آلات کاشتکاری کا رکھنا معیوب سمجھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت اور اس کی فوج کے سامنے کوئی شخص کسان سے زیادہ بے بس نہیں تھا لیکن دنیا کے سب سے بڑے طبقے کا ذریعۂ

معاش کاشتکاری تھا اور اگر کسان غلہ پیدا نہ کرتا تو شہر کے لوگ فاقے سے مر جاتے۔

شیخ نصیر الدین کی خیر المجالس، فوائد الفواد کے بتیس برس بعد لکھی گئی ہے اس زمانے (۷۲۲ھ تا ۷۵۵ھ) میں ہندوستان میں بہت تبدیلیاں ہوئیں محمد بن تغلق نے قریباً پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا، پھر اس کی تہائی فوج طاعون میں تباہ ہو گئی۔ شمالی ہندوستان میں پانچ یا چھ سال تک پانی نہ برسنے کی وجہ سے بہت سخت قحط رہا اور فاقے سے جانیں ضائع گئیں۔ بنگال، دکھن اور جنوبی ہندوستان میں بغاوتیں ہوئیں اور سلطنت دہلی کے ہاتھ صرف شمالی ہندوستان کے صوبے اور وہ بھی بنگال کو نکال کر، رہ گئے۔ اس تجربے کی بنیاد پر شیخ نصیر الدین نے لقمۂ حلال کی وضاحت کرنا ضروری سمجھا۔

جہاں تک کہ بادشاہ وقت اور حاکم طبقے کا سوال ہے، شیخ نصیر الدین اور حضور کے نقطۂ نظر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ (۱) شیخ نصیر الدین اُن رہنماؤں میں تھے جنھوں نے فیروز شاہ تغلق کو تخت پر بٹھانے کی ذمہ داری لی تھی۔ لیکن اس کے بعد آپ کا فیروز شاہ سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے جوامع الکلم کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب فیروز شاہ آپ کی خانقاہ میں آپ سے ملنے آیا تو آپ نماز میں مشغول رہے اور بادشاہ کو بغیر ملاقات کیے ہوئے واپس جانا پڑا۔[۵] (۲) حکومت کے ملازموں کے بارے میں آپ فرماتے ہیں: "اگر ایک شخص کو چھوٹا سا بھی حکومت کا شغل مل جاتا ہے تو وہ بندگانِ خدا سے جس طرح کا برتنا چاہے کرتا ہے اور دوسروں کے دل

---

۵ خیر المجالس۔ انگریزی تمہید، صفحہ ۵۹-۵۸

دکھانے سے نہیں ڈرتا۔ آخر دلوں کی آہ کا بھی کچھ اثر ہے[1]۔ (۳) مجلس بست و پنجم میں حمید قلندر لکھتے ہیں: "ایک دانش مند (یعنی تعلیم یافتہ) آدمی آیا اور اس نے عرض کیا کہ فلاں ملک نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ شیخ نصیر الدین نے پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے۔ دانش مند نے جواب دیا کہ اس پر کوڑے پڑ رہے ہیں چونکہ اس سے مال کا حساب لیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ حکومت کی نوکری بھی پھل لاتی ہے، خاص اس زمانے میں[2]۔"

لیکن جہاں تک روزی کمانے کا سوال ہے آپ نے فرمایا ہے کہ "روزی کمانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آدمی کا خدا پر بھروسا (یعنی توکل) نہیں ہے۔ اگر ایک شخص کے ذمہ اس کا خاندان ہے اور وہ روزی کماتا ہے لیکن اس کے دل کی نظر اس کے کسب پر نہیں ہوتی بلکہ اس کے خاندان کے حق پر ہوتی ہے تو وہ شخص متوکل ہے[3]۔" خیر المجالس میں مختلف طبقے کے لوگوں کا بیان ہے جو آپ سے ملنے آئے اور جن کے طریقۂ روزگار پر آپ نے رائے دی۔ یہاں صرف چند مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ (۱) ایک دانش مند آیا۔ شیخ نے اس کا حال دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ میں دیوانِ شاہی کا ایک افسر ہوں۔ تمام دن مجھے دیوان میں بیٹھے رہنا پڑتا ہے اور ہر فرمان کی روایت کی صحت مجھ سے طلب کرتے ہیں، اس لیے مجھے دن کو فرصت نہیں ملتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ دیوان کی نوکری میں کوئی برائی نہیں ہے اگر خلقِ خدا سے نیکی کا معاملہ رکھو[4]۔" (۲) سہالی گاؤں سے ایک تعلیم یافتہ

---

[1] خیر المجالس۔ مجلس سی دیکم، صفحہ ۱۰۴ — [2] صفحہ ۸۶

[3] خیر المجالس۔ مجلس یازدہم، صفحہ ۵۶

[4] خیر المجالس، مجلس سوم، صفحہ ۱۲، ۱۳۔

آدمی آیا۔ آپ نے پوچھا کہ تمھاری مشغولی کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ نیک کام ہے۔ اس میں بے گناہ بچوں سے مشغولی ہے اور قرآن سے مشغولی ہے، علاوہ اس کے تم تمام دن مسجد میں باوضو رہتے ہو[۱]۔ (۳) بہت عزیز حاضر تھے۔ آپ نے ہر ایک سے پوچھا کہ تمھاری مشغولی کیا ہے؟ ان میں سے ایک نے جواب دیا کہ میں کھیتی کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ لقمۂ زراعت نیک لقمہ ہے . . . پھر آپ نے امام غزالی کے حوالے سے ایک کسان کی یہ دُعا بیان کی : دل شاکر اور زبان ذاکر کے ساتھ میں بیج زمین پر پھینکتا ہوں۔ میری اُمید ہے کہ جو اس کو کھائے گا قوت حاصل کریگا اور اس قوت کو عبادتِ خدا میں صرف کریگا۔ (۴) ایک بزرگ، مردِ صالح اور متدین ملتان سے تشریف لائے۔ آپ نے ان سے ان کا حال پوچھا۔ انھوں نے عرض کیا کہ میرا ذریعۂ معاش تجارت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی لقمہ لقمۂ تجارت سے بہتر نہیں ہے[۲]۔ لیکن اسی کے ساتھ آپ نے صاف کر دیا کہ تاجر کو ایماندار ہونا چاہیے اور خریدنے والے کو قیمت میں دھوکا نہ دینا چاہیے۔ (۵) ایک مردِ سن رسیدہ حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کا حال دریافت کیا۔ وہ حکومت کی نوکری چاہتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اس زمانے میں آدمیوں کو نوکری کے لیے تلاش کر رہے ہیں۔ نوکری میں کوئی خرابی نہیں ہے لیکن اپنی (روحانی) مشغولی کا خیال رکھنا چاہیے اور اس کو ترک نہ کرنا چاہیے[۳]۔ (۶) مجلس بست و ہشتم میں حمید قلندر لکھتے ہیں : ایک سید نے اس ضعیف کے ساتھ

---

[۱] خیر المجالس، مجلس سی و دوم، صفحہ ۱۰۷۔

[۲] خیر المجالس، مجلس پنجاہ و ہفتم، صفحہ ۱۸۲ - ۱۸۳۔

[۳] خیر المجالس، مجلس شصت و یکم، صفحہ ۲۰۱۔

آپ کی خدمت میں پہنچ کر مرید ہونے کا ارادہ کیا۔ آپ نے نام پوچھا۔ انھوں نے کہا۔ شرف الدین۔ پھر آپ نے پوچھا' کیا کام کرتے ہو۔ سید کو جواب دینے میں تامل ہوا۔ چونکہ میں جانتا تھا میں نے کہا کہ یہ بہتر بازار جواہر ہیں۔ صالح سید ہیں اور ان کی والدہ ایک بزرگ بی بی ہیں۔ ان کا مکان پاک ہے اور جو کچھ ہے درویشوں کے لیے ہے۔ شیخ نصیر الدین نے ان کو بیعت میں لیا' دو رکعت نماز پڑھنے کا حکم دیا اور ایک ٹوپی دی۔ . . . اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ خریدنے اور بیچنے میں دروغ گوئی نہ ہونا چاہیے[1] (۷) ایک سید جو سرکاری نویسندگان (محرّروں) میں نوکر تھے مرید ہونے کے لیے آئے۔ آپ نے ان کو مرید کر لیا اور اس کے بعد فرمایا کہ میری وصیت یہ ہے کہ جو خدا اور اس کے رسول نے منع کیا ہے اس کو نہ کرو[2]۔ (۸) ایک پرہیزگار لشکری آپ کی خدمت میں بیٹھا تھا۔ آپ نے اس کا حال پوچھا اور پھر فرمایا: اگر طلب دنیا میں نیت نیک ہے تو یہ بھی طلب آخرت ہے۔

---

[1] صفحہ ۴ ۔ ۹۳

[2] خیر المجالس، مجلس ہفتاد و ہشتم، صفحہ ۲۴۲۔

[3] خیر المجالس، مجلس ہشتاد و پنجم، صفحہ ۲۵۴

آٹھواں باب

مذہبی رواداری

ہندو مذہب کے علاوہ اور سب مذاہب کا دعویٰ رہا ہے کہ ہمارے سوا اور کوئی راہِ فلاح نہیں ہے۔ ہندو دھرم میں ذات پات کے قوانین بہت سخت تھے لیکن اسی کے ساتھ ہندو فلاسفروں اور مفکروں کو وہ آزادی تھی جس کا کسی اور مذہب میں تصور کرنا بھی محال ہے۔ مثلاً شری کرشن (بحیثیت اوتار خدا کے) بھگوت گیتا میں فرماتے ہیں: "جو شخص کسی دیوتا یا معبود کی خلوص سے عبادت کرتا ہے تو وہ میری عبادت ہوتی ہے"[۱] لیکن جب مختلف مذاہب کے لوگ آپس میں مل کر کام کرتے ہیں یا ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے ہیں تو ان کو اپنے ہم مذہبوں کی خامی اور دوسرے مذہب والوں کی خوبی کا احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ دعویٰ صرف لفظی یا فرضی رہ جاتا ہے۔ بایں ہمہ مذہبی رہنماؤں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا بازار گرم رکھنے کے لیے اپنے مذہب کی دوسرے مذاہب کے مقابلے میں تعریف کرتے رہیں۔

اسلامی صوفیوں میں سب سے پہلے شیخ محی الدین ابن عربی نے اسلام اور

---

[۱] میں سنسکرت سے ناواقف ہوں، یہ جملہ میں نے ایلڈوس ہکسلے کے انگریزی ترجمے سے ترجمہ کیا ہے۔

دیگر مذاہب کو ایک ہی ترازو میں رکھا ہے اور سب کو خدا کے راستے بتلائے ہیں[1]۔ شیخ ابن عربی کے طریقۂ تحریر کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو اعتراض ہوا، لیکن اسی خیال کو مولانا روم نے ایک قصے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ قصے کے آخر میں ایک لمبی وحی ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوتی ہے۔ اور اس وحی کے دو شعر حسب ذیل ہیں:

ہر کسی را سیرتے بنہادہ ایم
ہر کسی را اصطلاحے دادہ ایم
ہندیاں را اصطلاح ہند مدح
سندھیاں را اصطلاح سند مدح

(یعنی باری تعالیٰ نے ہر قوم کو ایک اخلاق یا سیرت عطا فرمائی ہے اور ہر قوم کو ایک مذہبی اصطلاح دی ہے۔ ہندوالوں کے لیے ہند کی اصطلاح تعریف کہی جائے گی اور سندوالوں کے لیے سند کی اصطلاح تعریف شمار کی جائے گی[2])

حضور شیخ نظام الدین کے خیالات بھی قریباً یہی تھے۔ جن پندرہ یا سولہ سالوں میں امیر حسن سجزی نے فوائد الفواد قلمبند کی ہے، علاء الدین خلجی اور مبارک شاہ کی لڑائی ہندو راجاؤں سے رہی ہے۔ دونوں طرف سے تنخواہ دار لشکری لڑتے تھے اور مارے جاتے تھے۔ آپ کو سلطنت دہلی کی توسیع میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آپ نے لفظ "شہید" کسی مسلمان لشکری کے بارے میں استعمال نہیں کیا ہے۔

---

[1] مصر کے پروفیسر عفیفی کی کتاب شیخ محی الدین۔
[2] عربی تاجروں نے ہمارے ملک کے دو حصوں کا بیان کیا ہے۔ سند جہاں کے لوگ مسلمان ہو گئے باقی ملک میں ہندو مذہب تھا۔

لیکن اگر ایک مسلمان کو ہندو ڈاکو قتل کر دیتے تو آپ اس کو شہید سمجھتے تھے۔ یہ قصہ غلط ہے کہ سلسلۂ چشتیہ کے صوفیوں نے اسلام کی کوئی تبلیغی کوشش کی ہے۔ صوفیوں کے لیے یہ کام ناممکن تھا چونکہ ان کی اصطلاحیں اور ان کے روایات صرف تعلیم یافتہ مسلمان سمجھ سکتے تھے۔ مسلم صوفیوں کا کام مسلمانوں میں محدود تھا۔

مجلس مورخہ ۵ رمضان ۷۱۷ھ میں امیر حسن سجزی لکھتے ہیں: "ایک مسلمان غلام جو حضور کا مرید تھا، ایک ہندو کو اپنے ساتھ لایا اور کہا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ جب وہ دونوں بیٹھ گئے تو حضور نے دریافت کیا کہ تیرا بھائی کچھ اسلام کی طرف مائل ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں اس کو آپ کی خدمت میں لایا ہوں تاکہ آپ کی برکت کی نظر سے یہ مسلمان ہو جائے۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ نے فرمایا کہ لوگوں کے دل صرف کہنے سے نہیں بدلتے ہیں۔ ہاں اگر کسی نیک مسلمان کی صحبت سے مستفید ہوں تو ممکن ہے کہ اس کی صحبت کی برکت سے مسلمان ہو جائیں۔" پھر اور باتوں کے بعد حضور نے اسلام اور مسلمانوں کی صدق اور دیانت کے بارے میں کہا کہ شیخ بایزید بسطامی کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا۔ جب شیخ بایزید کا انتقال ہو گیا تو اس سے پوچھا گیا کہ تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟ یہودی نے کہا میں کیوں مسلمان ہوں؟ اگر اسلام وہ مذہب ہے جو شیخ بایزید کا تھا تو یہ میرے بس میں نہیں اور اگر اسلام وہ مذہب ہے جو میں تم لوگوں میں پاتا ہوں تو مجھے ایسے اسلام سے شرمندگی ہوتی ہے۔" مستند کتابوں میں یہی ایک موقع ہے جب آپ ایک ہندو کو مسلمان کر سکتے تھے اور حضور اس کو ٹال گئے۔ چنگیزی منگولوں کی جنگی کامیابی سے ظاہر ہے کہ ایشیائی مسلمانوں کی سیرت کا کیا حال تھا کہ ایسے خونخوار دشمن کے سامنے بھی مل کر کہیں بھی اچھا مقابلہ نہ کر سکے۔ حضور کے زمانے میں یہ بات ہر شخص کو معلوم

مجلس مورخہ ۲۲ ربیع الاول ۷۱۵ھ میں امیر حسن سجزی لکھتے ہیں: "حاضرین میں سے ایک نے پوچھا کہ ایک ہندو ہے اور کلمہ پڑھتا ہے، خدا کی وحدانیت کا قائل ہے اور رسول کی رسالت کا، لیکن جب مسلمان اس کے یہاں جاتے ہیں تو خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کی عاقبت کیا ہوگی؟ حضور نے فرمایا کہ یہ معاملہ اس کے اور خدا کے درمیان میں ہے، اگر خدا چاہے گا تو معاف کر دے گا، اور اگر چاہے گا تو سزا دے گا۔"

جب دہلی کی فوج نے دکھن پر قبضہ کیا تو ناگزیر تھا کہ بہت کشت و خون ہو۔ اور معصوم ہندو لڑکیاں اور لڑکے غلام بنائے جائیں۔ اس کا حضور کے دل پر بہت اثر پڑا۔ مجلس مورخہ ۱۱ رمضان ۷۱۵ھ (مطابق ۱۱ نومبر ۱۳۱۶ء) میں امیر حسن سجزی لکھتے ہیں: "بندے کی ایک عرضداشت تھی وہ میں نے بیان کی۔ جب میں دیوگیر میں تھا تو ملیح نے (جو میرا آزاد کیا ہوا خدمت گار ہے) پانچ تنکہ کی ایک چھوٹی لڑکی یا کنیزک خریدی۔ جب لشکر دہلی کی طرف روانہ ہونے لگا تو اس لڑکی کے ماں باپ آئے اور اپنی بےبسی اور بیچارگی میں ملیح سے درخواست کی کہ ہم سے دس تنکہ لے لے اور ہماری بیٹی ہم کو دیدے۔ میرے دل پر اُن کے رونے کا بہت اثر پڑا۔ میں نے اپنے پاس سے دس تنکہ ملیح کو دیئے اور کہا کہ تو نے اس لڑکی کو پانچ تنکہ میں خریدا تھا، میرے ہاتھ دس تنکہ میں بیچ دے۔ اس نے لڑکی کو بیچا اور میں نے خرید لیا۔ اس کے بعد میں نے لڑکی کو اس کے والدین کے حوالے کر دیا اور دس تنکہ جو وہ لائے تھے وہ ان کو واپس کر دیئے۔ بندے نے یہ کیا ہے، مخدوم کی کیا رائے ہے۔ حضور کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ نے فرمایا کہ تم نے نیک کام کیا ہے۔"

مسلمانوں میں حکام طبقے کی جو بھی امیدیں ہوں، حضور کے اخلاقی اور روحانی

نقطۂ نظر سے آپ کو آنے والے زمانے سے زیادہ اُمید نہ تھی۔ چنانچہ مجلس مورخہ ۲۷ ذیقعد ۷۱۲ھ میں آپ نے ذکر کیا کہ ہمارے رسول نے فرمایا ہے کہ میرے بعد پانچ طبقے ہوں گے اور ہر طبقے کی مدت چالیس سال کی ہوگی۔ پانچواں طبقہ "ہرج مرج" کا ہوگا۔ ہرج مرج کے معنی ہیں کہ مسلمان ایک دوسرے کے گوشت پوست اور قتل و خون میں گرفتار ہو جائیں گے۔ ان طبقوں کے دو سو سال کے بعد اگر فرزند آدم کے بجائے عورتیں کتا جنیں تو بہتر ہوگا۔ پھر حضور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپ نے فرمایا کہ یہ حکم رسول کے انتقال کے دو سو سال بعد ختم ہو گیا۔ موجودہ زمانے کے بارے میں آدمی کیا کہے؟"

اس قسم کی حدیثوں کو مستند نہیں سمجھا جاتا ہے لیکن قریب دو سو سال تک مسلمان تمام دنیا کی رہنمائی کرتے رہے۔ عباسی خلیفہ معتصم کے بعد یہ دور ختم ہو گیا اور مسلمان بادشاہوں کی آپس کی لڑائی شروع ہو گئی۔

ایک اور جگہ آپ فرماتے ہیں: "اگر ہمارے زمانے میں کسی کے بارے میں کہیں کہ وہ بُرا نہیں ہے تو اس کی بناء پر اس کو اچھا کہا جا سکتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اگر ایک شخص دوسرے آدمیوں کی عیب جوئی نہ کرے اور بُرے کو باوجود اس کے بُرا ہونے کے بُرا نہ کہے، تو اس کو نیک سمجھیں گے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اگر ایک آدمی خود بُرا ہے اور خلق خدا کو بھی بُرا کہتا ہے تو اس بُرائی کی کیا حد ہو سکتی ہے۔ (۲۷ شعبان ۷۱۵ھ)

طریق النجات

مطبوعہ

از:- افاضات عالیہ فاضل اجل عارف اکمل منبع فیوضات،
قدسی صفات، معرفت حقیقت دستگاہ، آیۃ من آیات اللہ
شد الزمن حضرت مولینا قبلہ محمد حسن صاحب مجددی فاروقی دامت برکاتہم

مع اردو ترجمہ

از عالیجناب فضائلمآب مولانا مولوی حکیم حافظ حضرت آغا
محمد ہاشم صاحب مجددی ابن حضرت مصنف ممدوح عم فیضہم

قیمت ———— ۳۲/- روپے

پروگریسو بکس
۴۰-بی اردو بازار ○ لاہور

وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ

كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ آدَمَ

اللّٰہ

كُلُّ مَا فِي الْكَوْنِ وَهْمٌ اَوْ خَيَالٌ اَوْ عُكُوسٌ فِي مَرَايَا اَوْ ظِلَالٌ

سنو آتی ہے ہر طرف سے صدا کہ باطل ہے ہر چیز حق کے سوا

خزینۂ معرفت

المسمّٰی بہ

تذکرہ عاشقِ ربّانی شیر یزدانی رحمۃ اللہ

مؤلفہ

صوفی محمد ابراہیم قصوری

قیمت ۴۵/- روپے

پروگریسو بکس
۴۰-بی اردو بازار ○ لاہور

ہر گل کو باغ دہر میں کھٹکا ہے خار کا
اُلجھا ہوا خزاں سے ہے دامن بہار کا

حضرت مُجدِّد رحمۃ اللہ علیہ
اور
اُن کے ناقدین

حضرت مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی (فاضل ازہر)
شاہ ابوالخیر مارگ ○ دہلی-۶

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

حیات اور تعلیمات

پروفیسر محمد حبیب مرحوم

پروگریسو بکس
۴۰ بی اردو بازار ۰ لاہور